دوزخ سے جنت تک

دمشق کے تہہ خانوں میں گزارے ہوئے شب و روز کی ڈائری

نام کتاب : دوزخ سے جنت تک
مصنف : مبارک صدیقی
ناشر : مکتبہ خلیل، اردو بازار۔ لاہور
سن اشاعت : 1990ء
قیمت : -/200 روپے
پروف ریڈر : رانا عبدالرزاق خاں

©جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

رابطہ مصنف
mubariksiddiqi@hotmail.com

انتساب

دنیا بھر کے بے گناہ قیدیوں کے نام

اللہ تعالیٰ جلد اُن کی رہائی کے سامان پیدا کرے

انسان بسا اوقات اپنی ہی غلطیوں کی وجہ سے کسی آزمائش میں گرفتار ہو جاتا ہے اور پھر دوسروں کو اسکا مورد الزام ٹھہراتا ہے۔ شہرِ دمشق میں گزارے ہوئے دنوں کو اپنی یاد داشت کے لئے میں نے ایک ڈائری میں لکھا ہوا تھا۔ میرے ایک بہت عزیز دوست نے اسے کتاب کی شکل میں شائع کرنے کی خواہش کا اظہار کیا سو اُس پیارے دوست کے خلوص کی وجہ سے یہ کتاب اس وقت آپکے ہاتھوں میں ہے۔ اس کتاب میں جتنے واقعات ہیں وہ ایسے ہی ظہور پذیر ہوئے۔ ہاں بعض جگہ بات کو واضح کرنے کے لئے چند فقرات کا اضافہ کیا گیا ہے جو کہ ذاتی تجربات کو کتاب کی صورت میں ڈھالنے کے لئے ضروری ہوتے ہیں یا جیسے کوئی مصور ایک منظر ہمیں دکھانے کے لئے مختلف قسم کے رنگ استعمال کرتا ہے ۔ تعداد اور فاصلوں میں کمی بیشی کا احتمال ہے مثلاً اگر کہیں میں نے لکھا کہ وہاں ہمارے ساتھ کوئی چالیس آدمی تھے تو ممکن ہے وہاں تیس ہوں یا پھر پچاس ہوں۔ شائد آپکو کچھ باتیں فسانوں جیسی لگیں سو آپ اسے فسانہ سمجھ کے ہی پڑھیں آپ کی صحت کے لئے بہتر ہوگا۔ بہت سے واقعات نہیں بھی لکھے کیوں کہ ممکن ہے یہ ڈائری کسی بچے کے ہاتھ بھی لگ جائے اور وہ واقعات اُس کے لئے پریشان کن ہوں۔ ہر تصویر کے دو رُخ ہو سکتے ہیں۔ عین ممکن ہے کہ کوئی ملک شام کی سیاحت کو جائے اور وہ لکھے کہ شام دنیا کا سب سے خوبصورت نظام والا اور پر امن ملک ہے اور ہو سکتا ہے کسی کی رائے اس کے برعکس ہو۔ بالکل ایسے ہی جیسے دو دوستوں نے ایک گلاس کو دیکھا جو پانی سے آدھا بھرا ہوا تھا۔ ایک نے لکھا کہ گلاس آدھا بھرا ہوا تھا اور ایک نے لکھا کہ گلاس آدھا خالی تھا۔

غالب کا ماننا ہے کہ ایک دیدہ بینا، جُز میں کُل اور قطرے میں دجلہ دیکھ اور دکھا سکتا ہے۔ میری یہ پہلی کتاب ہے۔ میں ایسا اچھا لکھاری تو نہیں ہوں اس لئے ہو سکتا کہ کہیں کی بات کہیں نکل جائے لیکن پھر بھی کوشش کی ہے کہ جہاں ہم تھے وہ مقامات آپکو بھی بذریعہ تحریر دکھا سکوں۔

مبارک صدیقی

(لاہور 10 جنوری 1990)

○○○

آخر کار وہ دن بھی آن ہی پہنچا تھا جب ہم دوستوں کا گروپ کراچی ایئرپورٹ کے

ٹرمینل کی طرف بڑھ رہا تھا آج ہم ملکِ شام کو پرواز کرنے والے تھے۔ ہمارے آگے آگے ہمارے گروپ لیڈر ہمارے ٹریول ایجنٹ صاحب تھے جو کہ شکل وصورت سے انتہائی مومن اور کوئی پہنچے ہوئے عالم دین لگتے تھے۔ نورانی چہرہ، سفید بے داغ شلوار قمیض، لمبی سفید داڑھی ہاتھ میں تسبیح، ماتھے پر سجدوں کے گہرے نشان ایک عجیب روحانی سا نظارہ پیش کر رہے تھے ۔ اُن کی صورت دیکھ کے لوگ مرعوب ہو کے اُنہیں حاجی صاحب کہہ رہے تھے۔ کچھ عرصہ قبل میرے ایک دوست نے اُن کا غائبانہ تعارف کروایا تھا یہ کہہ کر کہ یہ صاحب انتہائی نیک دل اور متقی ہیں اور محض انسانی ہمدردی کی خاطر پاکستان میں گھبرائے ہوئے نوجوانوں کو فی سبیل اللہ جرمنی بھجواتے ہیں اور یہ بالکل الگ بات ہے کہ اپنا معاوضہ ایڈوانس لیتے ہیں ۔ لاہور کے علاقے سمن آباد میں رہتے ہوئے بھائی لوہاری کی بے ہنگم ٹریفک میں موٹر بائیک پہ گھومتے ہوئے یکدم فرینکفرٹ جرمنی جانے کا خواب بہت اچھا لگا جہاں کے بارہ میں یار لوگوں نے بتایا تھا کہ وہاں کے لوگ جانوروں تک سے اتنا پیار کرتے ہیں کہ انسانوں کو بھی جانوروں جیسے حقوق حاصل ہیں میرا مطلب ہے کہ انسانوں سے تو پیار کرتے ہی ہیں جانوروں کے بھی اپنے حقوق ہیں۔ میرے ایک بہت ہی پیارے دوست جو چند ماہ قبل ہی جرمنی پہنچے تھے وہاں سے فون کر کے جرمنی کی اتنی تعریفیں کرتے تھے کہ سننے والے کا

دل چاہتا تھا کہ اُڑ کے وہاں پہنچ جائے۔سڑکیں ہیں گویا شیشے کی بنی ہوئی ہیں ۔ قصاب ایسے

خوبصورت ایپرن پہنتے ہیں کہ ہمارے ملک کے سرجن لگتے ہیں ۔ جون جولائی کی تپتی دوپہروں میں جب ہمارے لاہور میں بجلی گئی ہوتی تھی فون کر کے بتاتے تھے کہ وہاں جرمنی میں مِلک شیک درجنوں رنگوں میں اور درجنوں ذائقوں میں وافر مقدار میں ملتا ہے ۔فون کے دوران بھی معلوم ہوتا تھا کہ وہ ملک شیک پی رہے ہیں کیونکہ غٹا غٹ کی آواز آرہی ہوتی تھی جو کہ ہماری پیاسی روح کو اور بھی تڑپاتی تھی۔

ہمارے لئے اُسکی باتیں کسی افسانے سے کم نہ تھیں سو ہم نے اپنے بڑے بھائی جان مبشر صدیقی صاحب سے جو کہ اُن دنوں برطانیہ سے پاکستان آئے ہوئے تھے ، اپنے جرمنی جانے کے ارادے کا اظہار کیا اور اُن کے روبرو اُنکی اچھی صفات کا مبالغہ آرائی سے ذکر کیا جس سے متاثر ہوکر انہوں نے مطلوبہ رقم عاجز کو دینے کو پیشکش کردی ۔میرا دل تو چاہ رہا تھا کہ فوری طور پر یہ پیشکش قبول کر لوں لیکن وضع داری قائم رکھتے ہوئے میں نے انہیں کہا کہ میں یہ رقم صرف اس شرط پر لوں گا کہ یہ قرض حسنہ ہوگا۔ میں نے انہیں اصل بات نہیں بتائی کہ آجکل قرض حسنہ اُسے کہتے ہیں کہ جب قرض واپس مانگا جائے تو قرض دار قرض واپس کرنے کی بجائے صرف ہنسنا شروع کردے ۔ اگلے کچھ دنوں میں مبشر بھائی نے رقم خاکسار کے حوالے کردی ۔ رقم لیتے وقت بھی میں نے قومی وقار کو برقرار رکھا اور اُن پہ واضح کیا کہ ہم ایک خوددار قوم ہیں اور غیر ملکی امداد کو ہاتھ لگانا پسند نہیں کرتے اسلئے خاموشی سے یہ رقم میری دائیں جیب میں ڈال دیں۔

اللہ اللہ کر کے ایجنٹ کے پیسوں کا بندوبست کیا اور آج ہم کراچی ایئرپورٹ میں داخل ہورہے تھے ۔ ہمارے ایجنٹ صاحب نے ہمیں بتایا تھا کہ وہ ہمیں پہلے ملک شام لے کر جائیں گے جہاں جرمنی ایمبیسی میں کام کرنے والے کچھ لوگ اُنکے مرید و معتقد ہیں ۔ اُن سے جرمنی کا اصل ویزہ لگوا کر اور ملک شام میں دو دن سیر و تفریح کے بعد ہم جرمنی پہنچ جائیں گے ۔ ہمارے

گروپ میں کوئی پانچ مرد اور دو خواتین تھیں یعنی ہم کل سات تھے۔ خواتین میں سے ایک میرے دوست کی اہلیہ تھیں جبکہ دوسری بزرگ خاتون میرے ایک بڑے پیارے اور عزیز دوست کی والدہ تھیں یعنی ہم کل سات لوگ تھے۔ میری اہلیہ ساتھ نہیں آئیں تھیں کیونکہ مجھے پتہ ہی نہیں تھا کہ وہ کون تھیں کیونکہ میری ابھی شادی ہی نہیں ہوئی تھی۔ آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ میں ابھی تک ایک آزاد ملک کا آزاد شہری تھا اور ہر غیر شادی شدہ کی طرح بے فکرا اور بے خوف قسم کا آدمی تھا۔ ایئر پورٹ میں داخل ہوتے ہی ایک خوش پوش نوجوان نے ہمارے ایجنٹ کا والہانہ استقبال کیا، کسی ''بڑے حاجی صاحب'' کا حال احوال پوچھا اور پھر ہم سے بھی ایسی گرمجوشی سے ہاتھ ملایا کہ ہمیں یقین ہو گیا کہ ہم واقعی معزز لگ رہے ہیں اور ہمارے درزی نے پہلی بار ہمارے کپڑے ہمارے ہی ماپ کے سئے ہیں۔ ہمارے ایجنٹ نے سبکو ایک طرف کھڑا ہونے کا حکم دیا مجھے ایک طرف بُلا کے ایک کالے رنگ کی موٹی سی ڈائری میرے حوالے کی اور کہا کہ اسے خوب احتیاط سے رکھنا کیونکہ اس میں دمشق کے وہ سارے ایڈریس موجود ہیں جہاں جہاں ہمیں جانا ہے۔ اس سے

پہلے کہ میں کچھ کہتا مجھے زبردستی ڈائری تھما کے ہمارا ایجنٹ اُسی خوش پوش نوجوان کے ساتھ کوئی دس پندرہ منٹ کے لئے اندر چلا گیا۔ آپ قارئین کو شائد عجیب لگا ہو کہ میں حاجی صاحب کو چلے گئے کی بجائے ''چلا گیا'' کہہ رہا ہوں۔ بات کچھ ایسے ہے کہ میں نے اس سے پہلے لکھا تھا کہ وہ شکل وصورت سے انتہائی مومن اور کوئی پہنچے ہوئے عالم دین لگتے تھے لیکن میں یہ بتانا بھول گیا کہ وہ ایک بات میں کوئی دو تین گالیاں ضرور نکالتا تھا۔ ایئر پورٹ پر کسی شریف آدمی نے ہمارے ایجنٹ کی توجہ اُسکے ضرورت سے زیادہ لٹکتے ہوئے آزار بند یعنی نالے کی طرف دلوائی تو انہوں نے فوراً اپنی شلوار کا نالہ اوپر کھینچتے ہوئے اپنے ہی نالے کو بڑی سی

گالی دی اور پھر وہی گالی اُس شخص کو دی جس نے اس طرف توجہ دلوائی تھی۔ ہماری شاعرانہ طبیعت پر یہ کافی گراں گزرا کہ دو مختلف چیزوں کو ایک جیسے مخاطب کیسے کیا جا سکتا ہے۔

یہاں میں اپنے اس ناخوشگوار تجربے کی بناء پہ اپنے قارئین کو ایک نصیحت کرتا چلوں کہ کبھی کسی کا ظاہر دیکھ کر فوراً اُس کے متعلق اپنی رائے نہ قائم کرلیں بلکہ اُس حدیث پہ عمل کریں جسکا مفہوم یہ ہے کہ انسان کے اخلاق کا اُس وقت تک نہیں پتا چلتا جب تک اُسے شدید غصے یا شدید خوشی کے عالم میں نہ دیکھ لیا جائے۔ ہمارے ایجنٹ صاحب کو بھی دیکھ کے ایک روحانی سرُور ملتا تھا لیکن اُن سے گفتگو کر کے وہ سرُور کافور ہو جاتا تھا بہرحال آج ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں تھا ہمیں اپنے خوابوں کے جزیرے جرمنی پہنچنا درکار تھا۔ ائر پورٹ پر کافی دیر تک ہمیں ہمارا ایجنٹ اور ایف آئی اے کا وہ نوجوان ایک کونے میں کھڑے سرگوشیوں میں مصروف نظر آئے۔ اتنے میں ہی ہمارے گروپ کا ایک فرد بشارت صالح ٹہلتا ہوا میرے قریب آیا اور میرے کان میں یہ کہہ کے چلا گیا کہ یہ کالی ڈائری اپنے پاس نہ رکھو۔

اسکی اس بات نے مجھے پریشان کر دیا کہ آخر اس ڈائری میں ہے کیا جو وہ ایجنٹ اپنے پاس نہیں رکھنا چاہتا اور بشارت نے مجھے خبردار کیا ہے کہ یہ ڈائری اپنے پاس نہ رکھنا۔

اُس ایجنٹ اور بشارت صالح دونوں سے آج میری پہلی ہی ملاقات تھی اور میں فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ ان دونوں میں سے کون میرا ہمدرد ہے۔ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ وہ ایجنٹ میرے پاس آیا اور ایک بار پھر بڑی تاکید سے ڈائری کو سنبھال کے رکھنے کا کہا۔ میں نے جھٹ سے وہ ڈائری نکالی اور اسکے ہاتھ میں تھما دی اور اُسے کہا کہ میں ڈائری نہیں رکھنا چاہتا۔ اُس نے بڑے غصے کے ساتھ مجھ سے ڈائری لے کے اپنے بیگ میں ڈال لی اور کہا کہ آپ لوگ میرا چھوٹا سا کام بھی نہیں کر سکتے۔ یہ لو میں خود رکھ لیتا ہوں عام سی ڈائری ہے میں دل ہی دل میں بہت شرمسار سا

تھا کہ میں نے اپنے محسن کی اتنی سی بات بھی نہیں مانی لیکن ساتھ ہی ساتھ بشارت صالح کی بات بھی مجھے کھٹک رہی تھی۔ بہرحال امیگریشن سے کلیئر ہونے کے بعد ہم سب اندر انتظار گاہ پہنچ گئے جہاں سے اب اور کوئی چیکنگ نہیں ہونی تھی بس جہاز میں ہی سوار ہونا تھا۔ دنوں انتظار گاہ میں ساتھ ایک چھوٹی سی مسجد بھی موجود تھی ۔ ہمارے ایجنٹ نے جاتے ہی نماز شروع کر دی لیکن نماز کے دوران اُسکی ایک آنکھ برابر باہر اُس طرف دیکھ رہی تھی جہاں سے ہمارے گروپ کے ابھی دو مسافر اندر نہیں آئے تھے۔ پھر جلدی جلدی اُسنے نماز ختم کر کے جالی سے بنی ہوئی دیوار میں سے جھانک کے امیگریشن کے اُس حصے کی طرف دیکھنا شروع دیا جہاں ہمارے ایک دوست اور اُسکی والدہ کی تفصیلی تلاشی لی جارہی تھی۔ ہمارے ایجنٹ کا رنگ متغیر اور اُسکی تسبیح کے دانے تیزی سے گھومنا شروع ہو گئے ۔ وجہ پوچھنے پر اُس نے بتایا کہ کالی ڈائری اُس بزرگ خاتون کے بیگ میں ہے۔

جہاز کی پرواز کا وقت ہو چکا تھا۔ ہمارے نام پکارے جارہے تھے کہ ہم جہاز میں داخل ہوں

لیکن ہمارے دوساتھی ابھی تک تلاشی کے مرحلے سے گزر رہے تھے۔ کافی تشویشناک انتظار کے بعد میرے وہ دوست بھی اور انکی بزرگ والدہ صاحبہ بھی پریشان حال ہمارے پاس پہنچ گئیں اور ہم سب بھاگ دوڑ کے جہاز میں سوار ہوئے اور تھوڑی ہی دیر میں سیرین ایرلائن کا طیارہ فضاء میں بلند ہو چکا تھا۔ سبحان اللہ ہم فرینکفرٹ اور ہمبرگ کے خوبصورت شہروں میں جلوہ افروز ہونے کے لئے لئے روانہ ہو چکے تھے ۔ جہاز بلند ہوتے ہی ایجنٹ صاحب نے اُس بزرگ خاتون کے پرس سے اپنی کالی ڈائری واپس لی اور میری طرف فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ دیکھتے ہوئے کہا اتنی سی بات تھی۔ جہاز سے اپنے وطن عزیز کا منظر بہت خوبصورت تھا۔ ہمیں اوپر سے

اپنا ملک دیکھتے ہوئے اس پہ ترس بھی آیا کہ ہم جیسا خوبصورت شخص نکل جانے کے بعد اس ملک کے پاس فخر کرنے کے لئے رہ ہی کیا جائے گا لیکن ہماری بھی مجبوری تھی۔

شائد نماز فجر کا وقت ہوگا جب ہم دمشق کے ائر پورٹ سے باہر آئے۔شہر دمشق کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا کوئی

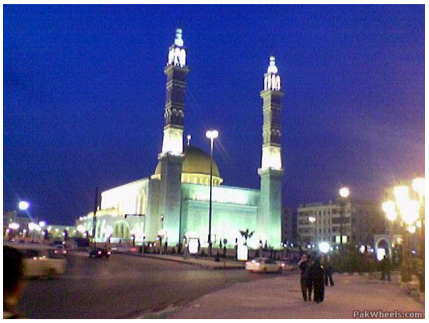

معمولی تجربہ نہ تھا۔ میں تاریخ کا کوئی ہونہار طالبعلم تو نہیں لیکن قدیم تہذیب وتمدن کو دیکھنا ہمیشہ سے میرا شوق رہا ہے اور آج میں اُس سر زمین پر قدم رکھ چکا تھا جو نبیوں کی زمین تھی۔ جو تمام ماہرین آثارِ قدیمہ کے متفقہ فیصلوں کے مطابق دنیا کا قدیم ترین آباد ملک تھا۔ یہ ملک بہت سی تہذیبوں اور ثقافتوں کا مرکز رہا ہے اور انسانی تاریخ اور ہنگاموں کا ایک خزانہ یہاں مدفون ہے ۔ یہاں صحرا بھی ہیں پہاڑ بھی ہیں وادیاں بھی ہیں دریا بھی ہیں اور مرغزار بھی ہیں۔ جتنا انسانی خون اس زمین نے پیا ہے شائد ہی کوئی اور ملک اس کی برابری کر سکے۔

بات ہو رہی تھی ایئر پورٹ سے دمشق شہر جانے کی۔ایئر پورٹ سے دمشق شہر غالباً کوئی دس بارہ میل دور ہوگا۔ میں بس کے شیشوں سے باہر دیکھتے ہوئے چشم تصور سے صدیوں پہلے کے وہ مناظر دیکھ رہا تھا جب یہاں سے زندگی کا آغاز ہوا ۔ مجھے یاد آرہا تھا کہ جاپانی ماہرین آثارِ قدیمہ نے لکھا ہے دمشق میں آٹھ لاکھ سال بھی انسان رہا کرتے تھے۔ ہمارے آباء و اجداد۔ یہی وہ خطہء زمین تھا جہاں حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوّا علیہ السلام رہا کرتے تھے۔یہیں پہ قابیل نے کاشتکاری کا آغاز کیا تھا اور ہابیل نے بکریاں چرانے کا کام۔یہیں پہ دنیا کا پہلا قتل ہوا جب حضرت آدم علیہ السلام کے بڑے بیٹے قابیل(CAIN) نے اپنے ہی چھوٹے بھائی ہابیل (ABEL) کو قتل کیا تھا اور شائد اسی کی بناء پر اسے دمشق یعنی دَم شَق کہا گیا۔وہ خون کچھ ایسا ہوا کہ اُسکا انتقام ابھی تک جاری ہے

۔ابتداء میں ساری دنیا ایک ہی ملک تھی۔ پھر لالچ اور تعصب کی تلوار سے زمین ٹکڑوں میں بٹتی چلی گئی۔ پھر وہ وقت بھی تھا کہ شام اردن فلسطین اور اسرائیل ایک ہی ملک ہوا کرتے تھے۔ پھر کوئی نامعلوم ہوس ملک کے اور بھی ٹکڑے کرتی گئی ۔ آجکل ملک ِشام، عراق ترکی لبنان اسرائیل اور اردن کے درمیان بسا ہوا ایک ملک ہے۔

مورخین کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کوئی پانچ سو سال قبل پرشین جنگجوؤں نے یہاں قبضہ جمایا ہوا تھا۔ پھر اسکے کوئی دوسو سال بعد میسی ڈونیا کے یونانی ہیرو

اور جنگجو بادشاہ سکندر اعظم نے اس سرزمین کو فتح کیا اور پھر اگر نئے دور کی بات کی جائے تو سن 634 میں خالد بن ولید نے اس خطہ زمین کو زیر نگیں کیا اور اس پہ حکمرانی کی۔ پھر سن 1400 کے اوائل میں تیمور بادشاہ نے تقریباً آدھے شہر کو قتل کر کے یہاں قبضہ کیا اور آج کی بات یہ ہے کہ سن 1970 سے یہاں کے موجودہ باتھ پارٹی کے سربراہ اور مطلق العنان بادشاہ حافظ الاسد نے اقتدار سنبھالا ہوا ہے۔1982 میں جب اسرائیل نے ایک مرتبہ پھر ظلم اور ناانصافی کرتے ہوئے لبنان پر حملہ کر کے لبنان کے کچھ حصوں پر قبضہ کیا تو جہاں لبنان میں حزب اللہ گروپ نے اسرائیلی تسلط کے خلاف مسلح جدجہد کا آغاز کیا وہیں شامی فوجیوں نے لبنان میں داخل ہو کے اسرائیل کی فوج کو باہر نکالنے کی کوشش شروع کر دی لیکن ساتھ ہی ساتھ خود بھی لبنان پر قابض ہو گئے۔

آج سن 1988 میں جب ہم شام میں داخل ہوئے ہیں تو لبنان پر شام کا ہی تسلط ہے اور اسرائیل اور لبنان کی سرحدوں پر گوریلا جنگ جاری ہے۔ اسرائیلی فوجی ظلم و بربریت کی مثالیں قائم کر رہے ہیں اور لبنان کی خوبصورت سرزمین پر گولہ باری کر رہے

ہیں۔لبنان کی اپنی گورنمنٹ ہے لیکن فیصلے شہرِ دمشق میں ہی ہوتے ہیں۔ بہرحال ہمیں سیاسی پس منظر یا پیش منظر سے کوئی غرض نہیں تھی۔

ہماری بس ائر پورٹ سے کوئی ایک گھنٹے کے بعد ایک درمیانے قسم کے ہوٹل پہنچ گئی۔ بلکہ بڑا ہی سادہ اور سستا قسم کا ہوٹل تھا۔فرشی بستر تھے اور ایک کمرے میں سات آٹھ افراد کے زمین پہ سونے کا انتظام تھا۔سفر کے تھکے ہارے ہم جہاں جگہ ملی سو گئے۔ اگلے دو روز ہمیں دمشق کی سیر کرنی تھی اور جلیل القدر شخصیات کے مقابر اور زیارتیں دیکھنی تھیں سو علی الصبح شام کے گلی کوچے دیکھنے کے لئے ہم ہوٹل سے باہر آ گئے۔ دمشق میں پھرتے ہوئے ہمیں تین چیزیں بڑی وافر نظر آئیں۔مسجدیں، ہر عمارت ہر دفتر ہر دکان پر حافظ الاسد کی تصویر اور ہر دوسرے موڑ پر بندوقیں تانیں ہوئے فوجی اور آرمی کے ٹرک۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ کلاشنکوفیں تھامے ہوئے فوجیوں کے درمیان زندگی رواں دواں تھی۔ دمشق میں بڑے بڑے عالیشان گھر بھی تھے اور غربت کی انتہاء کو پہنچے ہوئے لوگ بھی۔ عالیشان کاریں بھی تھیں اور افلاس کے مارے ہوئے زنگ آلود سائیکل بھی۔ہمیں کچھ بھی اجنبی نہ لگا۔ ہاں ایک بات اجنبی لگی۔ بازار میں ہر دوسرے موڑ پر کوئی شامی روٹیاں زمین پر رکھے ہوئے فروخت کر رہا تھا۔دمشق کے اس مرکزی حصے میں سڑکوں پر گلی کے ہر نکڑ پر نوجوان شراب کی ولائتی بوتلیں فٹ پاتھوں پر رکھے فروخت کرتے نظر آتے تھے اور یہ جائز تھا۔ اندرون لاہور کی طرح پرانی گلیاں بھی تھیں اور بڑی بڑی دمکتی ہوئی شاہراہیں بھی تھیں دمشق کے بازار بہت پر رونق اور آباد تھے۔ بڑی دکانوں کا تو علم نہیں لیکن چھوٹی چھوٹی مارکیٹوں میں خوب بھاؤ تاؤ ہوتا تھا اور اپنے دیس کے پٹھان یاد آتے تھے جو ٹیپ ریکارڈر دس ہزار کا کہہ کے بعد میں پانچ سو کا بھی دے دیتے تھے۔شہر

دمشق کے بیچوں بیچ دریائے برادا بہتا تھا ۔ویسے اگر امن اور فراخی ہوتو یہ ملک رہنے والا ہے ۔ خاص طور پر اُس کے لئے جسے تاریخ و ثقافت سے دلچسپی ہو۔ لوگ بہت پیار کرنے والے مہربان اور خوبصورت تھے۔ تقریباً ہر دکاندار نے اپنے ساتھ ایک قہوے کا تھرموس بھی رکھا ہوا تھا اور مہمان کو ایک کپ قہوہ پیش کرنے میں دیر نہ کرتے تھے ۔شام کے لوگ واقعتا بڑے مدد کرنے والے اور ملنسار تھے جس کو ایک دفعہ ہم مل لیتے وہ دوسری دفعہ ایسے ملتا جیسے پرانا واقف ہو۔ اُن کے اخلاق سے ہم بہت

متاثر ہوئے۔ تاہم مزاج میں انتہاء بھی موجود تھی۔ جہاں بہت پیار کرنے والے لوگ تھے وہیں یزید کے باقیات بھی نظر آتی تھیں۔ ہر عمارت پہ حافظ الاسد کی قدآدم تصویر عوام کو دیکھتی ہوئی موجود تھی ۔ میں فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ اسکا باعث محبت ہے یا خوف ۔ ویسے وہ محبت جو خوف سے پیدا ہوتی ہے زیادہ دیر نہیں رہتی ایک دن غضب کی صورت میں بہت کچھ تباہ کر دیتی ہے۔ میں نے ایک دو ٹیکسی والوں سے پوچھا کہ تم نے ٹیکسی میں حافظ الاسد کی تصویر کیوں لگائی ہوئی ہے تو جواب ملا ہمیں اپنے بادشاہ سے بہت محبت ہے۔ایک ٹیکسی والے نے میرے زیادہ سوال پوچھنے پر مجھے ٹیکسی سے فوراً اُتار دیا کہ تم مجھے خفیہ پولیس والے لگتے ہو۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ دمشق میں کھڑے ہو کے اردگرد دور تک پہاڑیوں کا سلسلہ نظر آتا تھا بلکہ یوں کہیں کہ پہاڑوں کے دامن میں ایک پیالے کی شکل میں

یہ شہر آباد ہے۔ ہمارے ساتھ ایک گائیڈ تھا جو ہمیں مختلف زیارتیں دکھاتا رہا اور ساتھ ساتھ ہمیں اسکی تاریخ سے آگاہ کرتا رہا۔ اُسکا یہ پیشہ تھا۔ معروف قبرستان باب الصغیر دیکھنے کا موقع ملا۔ حضرت بلال حبشی رضی

اللہ عنہ کا مزار مبارک دیکھا ۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام کے مزار پہ گئے ۔ حضرت آدم علیہ السلام کے چھوٹے بیٹے ہابیل کی قبر دیکھی بہت لمبی قبر ہے خدا جانے کیا حکمت ہے ۔ مسجد اُمیہ دیکھی ۔ تاریخ ساز سپہ سالاروں، صلاح الدین ایوبی اور خالد بن ولید کے مقابر دیکھے ۔ پھر ہمیں ہمارا گائیڈ اُس مقام پر لے گیا جہاں اُسکے بقول حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا علیہ السلام نے کچھ دیر عارضی قیام کیا تھا ۔ اُن پہاڑوں پر پھرتے ہوئے دل کی عجیب سی کیفیت تھی جو الفاظ میں بیان کرنا ناممکن ہے ۔ دمشق کے اردگرد وہ پہاڑ ابھی بھی اپنے اندر کچھ ایسی طلسماتی کشش رکھتے ہیں کہ لگتا ہے کہ ہمارا ان پہاڑوں سے کوئی پرانا رشتہ ہے ۔

چار پانچ دن خوب سیر کی ۔ دمشق کے کھانے بہت لذیذ تھے ۔ جس ہوٹل میں ہم ٹھہرے ہوئے تھے اس کے اور کمروں میں بھی کچھ پاکستانی تھے جو ہمارے اسی ایجنٹ کے ذریعے لائے گئے تھے یا اور ایجنٹوں کے ذریعے آئے تھے اور کئی کئی مہینوں سے وہیں مقیم تھے ۔ نماز کے وقت یار لوگوں نے زبردستی دھکیل کے مجھے آگے کر دیا سو پہلے دن سے ہی میں انکا امام مقرر ہو گیا ۔ ہوٹل میں پاکستانیوں کے دو تین گروپ تھے اور اب صرف ہمارے گروپ میں نو مرد تھے اور چار خواتین تھیں ۔ مختلف طبیعتوں کے لوگ تھے کچھ شہروں کے کچھ گاؤں کے اور کچھ گاؤں سے آگے کسی چک کے ۔ بعض بہت غصیلے اور ہتھ چھُٹ تھے اور بعض میری طرح شاعرانہ طبیعت کے مالک تھے ۔ ایک دن نماز کے بعد ہمارے گروپ کے سب افراد نے متفقہ طور پر میرے نہ چاہتے ہوئے بھی زبردستی مجھے امیر قافلہ بنا دیا اور کہا کہ جرمنی پہنچنے تک تمام فیصلے آپکے قبول ہوں گے جبکہ جرمنی جا کر ہر کوئی آزاد شہری ہو گا ۔ اتنی مختلف طبائع کے لوگوں کا امیر بننے سے میں نے صاف انکار کیا کیونکہ پہلے چار ہی دنوں میں دو احباب کی کسی غلط فہمی کی بناء پر بہت سخت ہاتھا پائی ہو چکی تھی جس میں تھپڑوں اور گھونسوں کے آزادانہ استعمال کے علاوہ لاتیں مارنے کے عظیم

الشان ہنر کا بھی مظاہرہ کیا گیا تھا۔ میں نے بہت انکار کیا لیکن صالح نصیر اور جمشید نے یقین دہانی کروائی کہ آپ صرف نام کے ہی امیر ہوں گے۔ کریں گے سب اپنی اپنی ہی۔

شام میں جہاں بعض پرشکوہ عمارتیں اور روپے پیسے کی فراوانی دیکھ کے خوشی ہوئی وہاں بعض لوگوں کی بے پناہ غربت اور مجبوریاں دیکھ کے پریشانی بھی ہوئی۔ مثلاً ہمارے ہی ہوٹل میں

بعض مجبور لڑکیاں ہر ہر دروازے پر دستک دیتی تھیں اور چند پیسوں کی عوض کمروں کی صفائی ستھرائی کے علاوہ ہر خدمت کے لئے تیار رہتی تھیں۔ ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے بعض لوگ ایسی مجبور لڑکیوں کی مدد کرنے کو انسانی ہمدردی قرار دیتے تھے۔ کافی پریشانی ہوتی تھی کہ دو ہزار مساجد والے اس شہر میں ابھی تک اتنی غربت اور مجبوریاں کیوں ہیں۔ تیسرے چوتھے دن ہم نے ایجنٹ کو بااصرار کہا کہ وہ ہمیں جرمن ایمبیسی کب لے کے جا رہا ہے کیونکہ ہمارے پیسے تیزی سے ختم ہو رہے ہیں۔ اُس نے ہم سب کو ایک کمرے میں بلایا، ہماری سادہ لوحی پر دو تین قہقہے لگائے اور پھر ہمارے سامنے ہی وہ کالی ڈائری کھولی۔ اُسکی جلد پھاڑی اور اُس میں سے جرمنی کے ویزوں کے سٹکر نکالے اور بڑی مہارت کے ساتھ ہمارے پاسپورٹوں پر چسپاں کر دیئے۔ ہم اتنی سادہ اور بے تکلف ایمبیسی دیکھ کے حیران رہ گئے اُس نے ہمیں بتایا کہ اسطرح وہ سینکڑوں نوجوانوں کو جرمنی بھجوا چکا ہے اور ویزوں کے اصلی یا نقلی ہونے کی ہمیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ شامی امیگریشن کو ویزوں سے نہیں رشوت سے غرض ہے جو انہیں پہنچائی جا چکی ہے۔

اگلے روز وہ مجھے اپنے ساتھ لے کے سارا دن مختلف ٹریول ایجنٹوں کے پاس جاتا رہا اور جرمنی کے لئے سستی ترین ٹکٹوں کی تلاش کرتا رہا۔ ایک چالاکی اُس نے یہ کی کہ خود کسی سے بات نہیں کی

بلکہ صرف مجھے ہی آگے کرتا تھا بات کرنے کو ۔چنانچہ میں نے کوئی تین چار ٹریول ایجنٹوں سے ٹکٹوں کے حصول کی بات کی ۔ آخر کار ایک ایجنٹ نے ہمیں اگلے روز ٹکٹیں دینے کا وعدہ کیا اور ہمارے پاسپورٹ رکھ لئے اور اگلے روز ہمیں آنے کا کہا۔اگلے روز خاکسار، محمد صالح بشارت اور جمشید تینوں دوست بڑے تیار ہو کے بال سنوار کے خوشبو لگا کے اس ایجنٹ کے دفتر میں جرمنی کی ٹکٹیں لینے پہنچے۔دمشق میں ہماری آزادی کا یہ آخری لمحہ تھا کیونکہ اگلے ہی لمحے پانچ چھ فوجی کلاشنکوفیں تانے ہوئے کمانڈوز کی طرح دھاڑتے ہوئے ہماری طرف بڑھے اور اس سے پہلے کہ ہم اس عزت افزائی کی وجہ پوچھتے ہمیں ہتھکڑیاں لگا کے کالے شیشوں والے فوجی ٹرک میں ایسے پھینکا گیا جیسے کوئی مزدور اجرت نہ ملنے پر سر سے بوری پھینکتا ہے ۔خوف کے مارے ہم تینوں خاموش تھے بلکہ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ ہماری آواز نہیں نکل

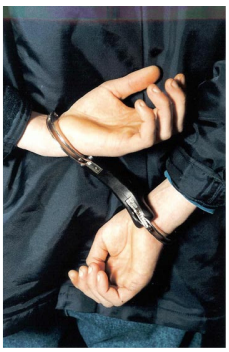

رہی تھی۔کوئی بیس منٹ یا آدھ گھنٹے کے بعد ٹرک رُکا۔ہمیں ایک بار پھر گھسیٹ کے نیچے اُتارا گیا۔ میں نے اپنے ساتھی سے کوئی بات کرنے کی کوشش کی تو ساتھ ہی ایک فوجی نے ایسا زناٹے دار تھپڑ رسید کیا کہ زمین میری آنکھوں کے آگے گھوم گئی۔ ہمارے سامنے شاہی قلعے جیسی کئی منزلوں والی ایک ہیبت ناک عمارت تھی جسکے در و دیوار سے وحشت ٹپکتی تھی۔ یقینا کوئی ایک ہزار سال سے پرانی عمارت ہو گی۔لوہے کا آہنی دروازہ کھلا اور فوجیوں سمیت ہم اندر داخل ہوئے۔تھوڑی ہی دیر میں ہمیں لگا جیسے ہم صدیوں پرانے کنویں میں اُتر رہے ہوں۔ مینار پاکستان کی سیڑھیوں جیسی تنگ و تاریک سیڑھیاں تھیں جو نیچے جاتے ہوئے ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔گول گول زینے اترتے ہوئے دائیں بائیں کمروں میں نظر پڑی جن میں قیدی بھیڑ بکریوں کی طرح بند تھے۔ اور پھر یہیں گزرتے ہوئے میں نے چند سیکنڈ کے لئے ایسا منظر دیکھا کہ مجھے لگا کہ میں نے کوئی خواب دیکھا

ہے۔

زینے اترتے ہوئے ایک چھوٹے سے موڑ پر سلاخوں سے بند اُس روشندان کے پار مجھے ایک بڑا ہال کمرہ نظر آیا جس میں مجھے بہت سے انسانی ڈھانچے ہلتے ہوئے نظر آرہے تھے۔ بے نور آنکھیں مدقوق چہرے اور جھولتے ہوئے جسم ۔میرا دل خوف کے مارے حلق کو آرہا تھا۔ آج کے دور میں یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ چنگیز، ہلاکو اور ہٹلر کے دور میں تو سنا تھا لیکن آج کل ایک اسلامی ملک میں یہ کیا ہورہا ہے۔ کیا دوزخ اسی خطہ زمین پر بھی موجود ہے۔ یہ کون لوگ ہیں اور کس جرم کی پاداش میں انہیں یہاں قید کیا گیا ہے۔ انہیں چھڑوانے کے لئے کوئی بولتا کیوں نہیں ہے۔ حافظ الاسد کی تصویر ہر جگہ کیوں آویزاں ہے۔ یہ سب سوالات سوچتے اب ہم کوئی تین منزلیں نیچے پہنچ چکے تھے۔ ہماری ہتھکڑیاں کھولی گئیں اور ایک چھوٹے سے دڑبہ نما کمرے کا آہنی دروازہ کھول کے ہمیں اُس کے اندر پھینک دیا گیا۔ ہماری حالت غیر تھی۔ جرمنی کے مرغزاروں میں جاتے جاتے یہ ہم کس تہہ خانے میں پہنچ گئے تھے۔ سگریٹ اور دھوئیں کی بدبو ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد آنکھیں اُس نیم روشن کمرے کے ماحول سے واقف ہوئیں۔ ایک چھوٹے سے کمرے میں جس میں عام طور پر دس بارہ انسانوں کو قید کیا جاسکتا ہے کوئی چالیس کے قریب قیدی ڈالے ہوئے تھے۔

سب سے پہلے میں نے ساتھیوں سے پوچھا کہ سیڑھیاں اُترتے کیا آپ نے بھی وہ منظر دیکھا ہے۔

اُن کا جواب نفی میں تھا اور اُنکا کہنا تھا کہ

سارے راستے اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ مجھے یقین ہونے لگا کہ وہ میرا واہمہ ہی ہوگا۔ آج کے ترقی یافتہ دور میں اور ایک اسلامی ملک میں ایسا ممکن ہی نہیں ہے۔ بہرحال اب ہم ایک چھوٹے سے کمرے میں کوئی چالیس کے قریب قیدی تھے۔

اس کمرے کے کونے میں ایک ٹائلٹ تھا جو زیادہ تر مصروف رہتا تھا۔اسکی بدبو سے طبیعت خراب ہونا شروع ہوگئی۔کمرے میں صرف کھڑے ہونے کی ہی جگہ تھی بیٹھنے کی گنجائش نہ تھی۔کافی دیر کھڑے رہنے کے بعد ہم تھک کے گر گئے۔ قیدیوں نے بتایا کہ یہ یہاں کی بدنام زمانہ جیل المزہ ہے یا شائد نظارا جیل ہے۔سب قیدی ایک ہی کشتی کے مسافر تھے سوکوئی

بُرا نہ مناتا تھا۔رات پڑی تو سب فرش پر لیٹ گئے۔میں نے لیٹے لیٹے اپنا سر ایک موٹے سے عربی کے پیٹ پہ رکھ دیا جو سانس لیتا تھا تو مجھے جھولے آتے تھے۔میرے سینے پر کسی افغانی نشئی کی ٹانگیں پڑی ہوئیں تھیں اور میری ٹانگیں ایک پاگل فرانسیسی قیدی انٹونی کے لئے سرہانے یعنی تکیئے کا کام دے رہیں تھیں۔ایک عجیب قسم کا بین الاقوامی اور بھائی چارے کا منظر تھا۔افغانی کافی ہٹا کٹا قسم کا آدمی تھا اور بار بار پہلو بدل کے ہم سب کو تنگ کر رہا تھا۔

میرے بچپن کے دوست جانتے ہیں کہ مجھے ہجوم والی جگہ پر سانس کی تکلیف ہو جاتی ہے اور یہاں سارے کمرے میں دروازے میں صرف ایک ہی کوئی ایک مربع فٹ کی چھوٹی سی سلاخوں والی کھڑکی تھی۔ مجھے سانس کی تکلیف شروع ہوگئی لیکن وہاں ایسی معمولی چیزوں کی پرواہ کرنے والا کوئی نہ تھا۔ جس تہہ خانے میں ہم تھے وہاں رات دن کا پتہ نہ چلتا تھا کیونکہ ہر وقت ایک جیسا ماحول اور وہی بلب کی مضمحل سی روشنی ہوتی تھی۔قیدیوں میں کئی لوگ مجھ سے بہت زیادہ تکلیف میں تھے۔پتا نہیں کیسے چوبیس گھنٹے گزر گئے اگلے روز دروازہ

کھلا اور چھ اور قیدیوں کو ہمارے اوپر پھینک دیا گیا۔ وہ سر اُٹھا کے ادھر اُدھر ایسے دیکھ رہے تھے جیسے مرغیوں کے بھرے ہوئے دڑبے میں

مزید چھ مرغیاں پھینک دی جائیں۔ معلوم ہوا کہ وہ ہمارے ہی باقی چھ ساتھی تھے۔ وہ دل برداشتہ اور حواس باختہ تھے جبکہ ہم انہیں تسلی دے رہے تھے اور دل ہی دل میں خوش ہو رہے تھے کہ چلو سب اکھٹے تو ہوئے ہیں۔ ہمہ یاراں جنت ہمہ یاراں دوزخ، انہوں نے بتایا کہ ہمارے گروپ کی چار عورتوں کو بھی گرفتار کر لیا گیا ہے۔ ہمارا ایجنٹ شام میں ہی کہیں روپوش ہو گیا ہے اُسنے جاتے ہوئے ہمارے لئے پیغام دیا ہے کہ کبھی میرا اصل نام حلیہ یا پتہ پولیس کو نہ بتانا کیوں کہ اس ملک میں صرف میں ہی آپکو چھڑوا سکتا ہوں اگر میں بھی جیل میں چلا گیا تو ہم ساری عمر انہیں جیلوں میں گزاریں گے۔ اُسنے بتایا کہ اب کوئی تبارک نامی پاکستانی ہمیں ملنے آئے گا جسے ہمارے ایجنٹ نے ایک بھاری رقم کے عوض ہمیں چھڑوانے کا فریضہ سونپا تھا۔ اب تک ہمیں معلوم ہو چکا تھا کہ ہمیں جعلی ویزوں کے جرم میں گرفتار کیا گیا ہے۔

اگلے روز ہم سب نو دوستوں کو اس کمرے سے نکال کے اسی عمارت کے ایک اور کمرے میں بلایا گیا اور مختصر بیان ہوئے۔ سب کو واپس اُسی چھوٹے کمرے میں بجھوا دیا گیا سوائے میرے۔ مجھ سے تین چار بڑے سخت گیر پولیس افسران عربی زبان میں سوالات پوچھتے رہے۔ میں نے انگلش میں جواب دینے کی کوشش کی تو اُن میں سے ایک مجھ پر تھپڑوں اور ٹھوکروں سے پل پڑا اور کہنے لگا عربی بولو۔ میں نے اردو اور انگریزی میں کہا کہ میں عربی نہیں بول سکتا۔ میرے عربی نہ بولنے پر وہ سیخ پا ہو رہے تھے۔ اسنے عربی میں مجھ سے پوچھا ما اسمك (تمہارا نام کیا ہے)۔ میں نے انگلش میں جواب

دیا کہ میرا نام مبارک ہے۔اُنکے لئے یہ ہی بہت بڑی کامیابی تھی کہ انہوں نے عربی میں مجھ سے پوچھا تھا اور مجھے سوال کی سمجھ آ گئی تھی۔ اُنکو کیا پتہ کہ اتنی عربی تو سب کو آتی ہے لیکن اُس وقت عربی زبان کا وہ انتہائی معمولی سا علم بھی میرے لئے مشکل کا باعث بن گیا ایک جذباتی قسم کے سپاہی نے میری گردن پر دو تین تھپڑ لگائے اور چیخا عربی بولو۔عربی بولو۔عربی بولو۔ مجھے عربی آتی ہوتی تو بولتا۔

پھر میز کے اُس طرف بیٹھے ہوئے بڑے پولیس آفیسر نے مجھے کرسی پر بیٹھنے کے لئے اشارہ کیا پانی پلایا اور انگلش زبان میں بڑی نرم آواز میں مجھے کہنے لگا کہ ہمیں معلوم ہے کہ تم جان بوجھ کے عربی نہیں بول رہے ۔تم ایک اسرائیلی دہشت گرد ہو جسکی ہمیں کئی برسوں سے تلاش ہے ۔اُسکی عجیب وغریب باتیں سن کے میری آنکھیں بھینگی ہو رہیں تھیں اور میں منہ کھول کے اُسکی طرف ایسے دیکھ رہا تھا جیسے وہ مجھے جادو کے کرتب دکھا رہا ہو یا کوئی تجسّس سے بھرپور کہانی سنا رہا ہو۔

اس نے ایک فائل کھولی اور ایک شخص کی تصویر میرے سامنے رکھ دی۔تصویر دیکھ کے میں ہکا بکا رہ گیا۔ میں نے اپنے چہرے اور جسم پر ہاتھ مل کے دیکھا۔ وہ واقعی مجھ سے ملتا جلتا کوئی شخص تھا صرف فرق یہ تھا کہ اُسکی داڑھی بھی تھی ۔ایک لمحے کے لئے تو مجھے بھی شک پڑ گیا کہ واقعی کہیں میں اسرائیلی دہشت گرد تو نہیں ہوں۔میں نے حواس جمع کرتے ہوئے اُسے ساری بات جلدی جلدی سنا دی کہ پاکستان سے کوئی ایجنٹ ہم سے پیسے لے کے ہمیں یہاں لایا ہے جرمنی بھجوانے کے لئے ۔فلاں ہوٹل میں ہم ٹھہرے ہوئے تھے ابھی ہمارے سوٹ کیس بھی وہیں پڑے ہیں۔ اُس نے اُسی وقت وہاں چھاپہ مارنے کا حکم دیا اور مجھے ایک طرف بیٹھنے کا حکم دیا ۔تھوڑی دیر بعد دو تین آدمی اندر داخل ہوئے یہ وہی ٹریول ایجنٹ تھے جن سے میں نے ٹکٹ کے لئے بات کی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی انہوں نے شور مچا دیا۔ہلا یلا واللہ پتہ نہیں کیا کہہ رہے تھے لیکن

مجھے لگا کہ کہہ رہے ہیں یہی ہے یہی ہے پکڑ لو جانے نہ پائے۔اُن کے چہرے خوشی سے ایسے تمتمارہے تھے جیسے انہوں نے مریخ پہ پانی ڈھونڈ لیا ہو۔ انہوں نے پولیس کو میرے متعلق یہی بیان دیا کہ یہی شخص ٹکٹوں کے حصول کے لئے بار بار ہمارے پاس آتا تھا۔ وہ پولیس آفیسر کوئی شریف قسم کا آدمی تھا۔اُس نے انہیں جانے کا حکم دیا،سگریٹ سلگائی اور بڑے دھیمے لہجے میں مجھ سے کہنے لگا میرا وقت ضائع نہ کرو سچ سچ سب کچھ بتادو تم کتنے عرصے سے انسانی سمگلنگ میں ملوث ہو اسرائیل سے کب شام پہنچے ہو۔کس کے لئے کام کرتے ہو وغیرہ وغیرہ۔اُس نے مجھے بتایا کہ یہ وہ جیل ہے جہاں سے کبھی کوئی باہر نہیں گیا جو بھی آتا ہے اُسکی لاش ہی باہر جاتی ہے۔اُسنے کہا کہ ابھی جب تمہیں اُلٹا لٹکائیں گے تو ایک گھنٹے میں تم فرفر عربی بولو گے۔میرا دل چاہا کہ اُسے کہوں کہ ہمارے عربی کے استاد اللہ بخشے ہمیں چار سال، چھٹی کلاس سے دسویں کلاس تک سوٹیاں مار مار کے عربی سکھانے کی کوشش میں دل برداشتہ ہو کے اللہ کو پیارے ہو گئے ہمیں تب عربی زبان نہیں آئی اب ایک گھنٹے میں کیسے آسکتی ہے لیکن ایسا ادبی مذاق کرنے کا وقت نہیں تھا میں نے پھر یہی کہا کہ میں ایجنٹ نہیں ہوں نہ ہی میں اسرائیلی دہشت گرد ہوں میں نے ایک ایجنٹ کو پیسے دیئے تھے کہ کسی طرح مجھے جرمنی پہنچا دو ۔میرے پیچھے کھڑا پولیس والا میرے بال دبوچے ہوا کھڑا تھا اور میرے سر کو ایسے دائیں بائیں ہلا رہا تھا جیسے اُسے اس کام میں لطف آرہا ہو۔ مجھے ہمیشہ سے سر میں مالش کروانے کا شوق رہا ہے لیکن اُس روز وہ ظالم میرے سر کے بال ایسے کھینچ کے دیکھ رہا تھا جیسے اُنکی پائیداری چیک کر رہا ہو۔ بڑا افسر مجھے کہنے لگا آج میں مار پیٹ کے موڈ میں نہیں ہوں اسلئے میں تمہیں چوبیس گھنٹے کی مہلت دیتا ہوں ضد نہ کرو مان جاؤ کہ تم ایک اسرائیلی جاسوس ہو۔ یہ کہہ کے مجھے واپس میرے ساتھیوں کے پاس لاک اپ میں بجھوا دیا گیا۔ کافی دیر بعد جب میرے ہوش ٹھکانے آئے تو دوستوں کو ساری بات

بتائی۔ ہمارے پاس وقت بہت کم تھا کسی کو بھی کسی وقت بلایا جاسکتا تھا چناچہ ہم سب مل کے بیٹھ گئے اور ایجنٹ کا ایک فرضی نام حلیہ اور اُسکا پاکستان کا پتہ وغیرہ سوچ لیا بلکہ ساری رات اُٹھ اُٹھ کے ایک دوسرے کو پوچھتے رہے کہ اگر اُسکا رنگ پوچھا تو کیا کہنا ہے۔ اُسک ناک کیسی ہے اُسکا قد کتنا ہے۔ ایک فلمی قسم کے دوست نے تو مشورہ دیا کہ سیدھا سیدھا سلطان راہی کی شخصیت کو ذہن میں رکھ لیا جائے تا کہ سب صحیح حلیہ بیان کرسکیں۔ اُسکا مشورہ معقول تھا لیکن پتا نہیں کیوں نہیں مانا گیا اور فرضی حلیہ ہی سوچا گیا۔

اگلے دن ہم سب کے الگ الگ بیانات ہوئے۔ جس کو لے جاتے تھے اُسے واپس نہیں لاتے تھے اس لئے ہمیں نہیں پتہ تھا کہ اُس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ تاہم وقتاً فوقتاً عمارت کے مختلف حصوں سے تشدّد اور چیخ و پکار کی آوزیں آ رہی تھیں جو پہلے بھی آتی رہتی تھیں۔ ہمارا ایک دوست جو کہ گاؤں سے تھا ہمارا ''ترا'' نکالنے میں پیش پیش تھا۔ کبھی کہتا کہ لگتا ہے اُلٹا لٹکا کے مار رہے ہیں۔ کبھی کہتا دس دس کوڑے کھانے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ کبھی کہتا ہمیں کرنٹ لگا کے ہم سے سب کچھ اگلوا لیں گے۔ ہم سب نے اُس کے آگے ہاتھ جوڑے کہ خدا کے لئے کچھ دیر خاموش ہو جاؤ۔ بہت تکلیف دہ انتظار کی گھڑیاں تھیں۔ مجھے بہت اچھی طرح یاد ہے کہ وہ وقت اس قدر تذبذب والا تھا کہ ہم سب چاہ رہے تھے کہ اگلی باری میری ہوتا کہ جو ہونا ہے جلدی سے ہو جائے۔ آخر کوئی چار گھنٹے بعد میری باری بھی آ ہی گئی۔ کافی دیر میرا انٹرویو ہوا۔ ایجنٹ کا حلیہ اور ٹھکانہ طے شدہ منصوبے کے تحت بتایا۔ انٹرویو کے آخر میں پولیس افسر نے مجھے کہا کہ جب تک وہ ایجنٹ گرفتار نہیں ہو جاتا آپ لوگ جیل میں رہیں گے کیونکہ صرف آپ یعنی ہم ہی اُسے پہچان سکتے ہیں۔ سیرین ایر لائن کو جرمنی کی حکومت نے لاکھوں ڈالر جرمانہ کیا ہے کہ وہ جعلی ویزوں پر مسافروں کو جرمنی لا رہی ہے اس لئے حکومت شام کے لئے ضروری ہے کہ اس حلئے کے ایجنٹ کو فوری گرفتار کیا جائے۔ یہ سنتے ہی

میرے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے کیونکہ اس حلئے کا کوئی ہوتا تو پکڑا جاتا۔اب اللہ ہی ہمیں بچا سکتا تھا ہماری تدبیر ہمارے لئے ہی مہلک ثابت ہوئی تھی لیکن ہماری مجبوری تھی کہ اُس ملک میں ہمیں جاننے والا ایک وہی ایجنٹ تھا ۔ہمیں اُسکے احکامات ماننے تھے ورنہ جنگ کے بعد کے اُن دنوں میں شام سے کسی ملک فون تک نہ ہوتا تھا نہ کوئی ڈاک آتی جاتی تھی کہ ہم کسی کو بتاتے۔

ہم سب کے انٹرویو ہو چکے تھے خدا کا شکر ہے کہ سب کے بیانات ایک جیسے تھے جسکی وجہ سے پولیس کو یقین ہوگیا کہ ہم خود مظلوم ہیں تاہم ہمارے بتائے گئے حلئے والے ایجنٹ کی تلاش میں چھاپے مارے جارہے تھے۔ایسا کوئی ہوتا تو ملتا۔ادھر ہم جیل کے شب و روز کے عادی ہو چکے تھے۔کوئی ایک ہفتے سے اس دڑبے میں ہم بند تھے۔ سارے قیدی واقف بن چکے تھے۔کھانے کا یہ انتظام تھا کہ دن میں دو مرتبہ وہ چھوٹی سی کھڑکی کھول کے پوچھتے کہ کسی نے کچھ منگوانا ہے تو پیسے دے دے۔سب پیسے دے کے منگواتے تھے یا بعض کہ رشتے دار انہیں کھانا بجھواتے تھے۔ہم اس جیل کی حوالات میں بند تھے اس لئے جیل کی طرف سے کچھ نہیں تھا پیسے نہیں ہیں تو بھوکے رہو چھین کے کھاؤ یا مر جاؤ ۔ہم روٹی منگوانے کے لئے پیسے دیتے تھے۔ جب وہ روٹی لاتے تو ایک ایک روٹی دور سے ایسے پھینکتے جیسے فرزبی پھینکتے ہیں۔ہم روٹی کھاتے اور اگر خریدی ہوئی پانی کی بوتل ختم ہو جاتی تو ٹائلٹ کے ساتھ لگی ٹونٹی سے پانی پیتے تھے۔عربی قیدیوں کو جب کبھی گھر سے کھانا آتا تو وہ دیوار کی طرف منہ کر کے کھاتے تھے تاکہ کوئی اور شامل نہ ہو۔کبھی کبھی کھانے پہ لڑائی بھی ہوتی تھی چھینا جھپٹی تو عام تھی۔کوئی ساتویں آٹھویں دن ہی ہم بھی اُنکے رنگ میں ڈھلنے لگے تھے۔ایک دن تو ایسے ہوا کہ کوئی کھانے کے لئے پوچھنے نہ آیا۔کھانا کھائے ہوئے چوبیس گھنٹے گزر چکے تھے پانی پی پی کے گزارہ کر رہے تھے۔اُسی روز ایک عربی کو اُسکے گھر والوں نے سالم مرغ روسٹ اور روٹیاں بجھوائیں۔ وہاں دمشق میں

سالم مرغ روسٹ جسے ہم چرغہ بھی کہتے ہیں بہت عام اور سستا ہے اس لئے بہت کھایا جاتا ہے۔ بہرحال یہ عربی دیوار کی طرف منہ کر کے تیزی تیزی سے دونوں ہاتھوں میں چرغہ دبوچ کے کھانے لگا۔ بھوک کے مارے میری حالت غیر ہورہی تھی میں نے اُسے کہا حبیبی حبیبی انا غریبی۔ مجھے بھی تھوڑا سا دے دو۔ اُسنے سختی سے میرے ہاتھ پہ ہاتھ مار کے مجھے پرے کیا۔ میں غمزدہ ہو کے خاموش بیٹھ گیا۔ دوسری طرف ہمارا ساتھی اشرف کاکا بیٹھا ہوا تھا۔ شاید وہ مجھ سے بھی زیادہ بھوکا تھا اور اُسنے میرا حشر دیکھ لیا تھا اُسنے تاڑ کے ایک ہی جھپٹا ایسا مارا کہ اُسکے ہاتھوں سے پورا چرغہ اچک لیا۔ کاکے، کی اس نازیبا حرکت پر ہم سب میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور ہم سب نے اپنا اپنا حصہ کاکے سے لیا۔ وہ عربی بھاری وجود کا اور ظالم آدمی تھا وہ کاکے پر گھونسے برساتا رہا لیکن کاکے نے ختم کر کے چھوڑا۔ کاکے کی جان چھڑانے میں ہم نے بھرپور مدد کی۔ میرے گروپ کے لوگ اُس عربی پر حملہ آور ہونے کی کوشش کر رہے تھے لیکن میں نے انہیں روکا کہ سراسر قصور ہمارا ہے۔ ہمارے گروپ کے نو افراد میں سے چار بہت سخت جان تھے۔ صالح بشارت، جمشید، نصیر تینوں بڑے طاقتور اور پھرتیلے تھے۔ ہمارے گروپ میں ہی فیصل آباد کا ایک نوجوان تو دو افراد پر اکیلا بھاری تھا۔ ذات کا بٹ تھا لیکن صحت میں بٹ برادری کا سردار تھا۔ میں باقی دوستوں کی نسبت سب سے کمزور تھا۔ ہمارا ایک ساتھی اختر ایک لمبا تڑنگا اور کڑیل نوجوان تھا جو دل کا نرم تھا لیکن اُسکے قدو قامت کی وجہ سے قیدی اُس سے دبک کے رہتے تھے۔ اشرف کاکا، ہلکے جسم کا تھا۔

کھانے پہ لڑائی پہ ایک بات یاد آئی جو لکھنا نہیں چاہتا لیکن پتہ نہیں کیوں لکھ رہا ہوں اور بڑے بوجھل دل کے ساتھ لکھ رہا ہوں۔ ایک دن ایک اور نوجوان کو اس کال کوٹھڑی میں دھکیلا گیا۔ اس سے میں نے پوچھا کہ تم کس جرم میں آئے ہو تو اُس نے بتایا کہ یہاں شام میں ہر نوجوان کے لئے فوج میں دو سالوں کے لئے جبری بھرتی کا

قانون ہے۔ مجھے بھی فوج میں جانے کا کہا گیا ہے۔میرے انکار پر مجھے جیل بھیج دیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ پہلے تو دو سال کی آپشن تھی اب بطور سزا یا ساری عمر جیل رہو یا ساری عمر فوج میں۔کسی امیر اور متمول گھرانے کا نوجوان لگ رہا تھا۔ پہلے روز ہی اس نوجوان کے گھر والے اسے کھانا ٹفن میں دے گئے۔اس نوجوان نے ٹفن پکڑا اور ہم سب سے مخاطب ہو کے کہنے لگا آؤ دوستو مل کے کھاتے ہیں۔اُسکا یہ فقرہ سُن کے ہم سب حیران ہوئے اور مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ صالح بشارت ، اور جمشید نے بیک وقت ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور کہا کہ یہ شخص مسلمان نہیں لگتا۔شائد وہ کچھ اور کہنا چاہتے تھے۔

بہرحال کھانا کھایا اُسکا شکریہ ادا کیا اور رازداری سے پوچھا کہ کیا تم مسلمان ہو۔اُس نے کہا میں یہودی ہوں۔اب میں کیا لکھوں کہ کیوں ہمیں چپ لگ گئی۔سخاوت فیاضی اور مہمان نوازی قربانی اور ایثار کے لئے تو ہمارے آباؤ اجداد مشہور ہیں اور ایسی صفات کے تو ہم دعویدار ہیں۔ہمیں اس جیل میں کیا ہوتا جا رہا ہے۔

جیل میں ہر کوئی ہم سے یہ ضرور پوچھتا تھا کہ تم سنی ہو یا شیعہ۔انکا خیال تھا کہ پاکستان میں شیعہ سنی ایک دوسرے کو دیکھتے ہی لڑنا شروع کر دیتے ہیں۔کوئی ایک ہفتے بعد ہمیں بتایا گیا کہ آپ کا کوئی ملاقاتی آیا ہے۔ہم بہت خوش ہوئے کہ ہماری بھی کوئی عزت ہے۔ملاقاتی نے بتایا کہ اُسکا نام تبارک ہے۔ ہمارا ایجنٹ سب کچھ اُسے بتا کر پاکستان فرار ہو گیا ہے۔اب وہ ہم سے رابطے میں رہے گا اور جلد چھڑوانے کے لئے کوشش کرے گا۔وہ بہت اچھا آدمی تھا اُسکی ایجنٹ سے پیسوں کی جو بھی ڈیل ہوئی تھی وہ اُسکا ذاتی معاملہ ہے لیکن اُسنے ہماری بہت مدد کی۔

ایک روز ہمیں بتایا گیا کہ تمارا کوئی ملاقاتی آیا ہے کھانا لے کے۔شام میں ہمارا تبارک کے علاوہ کوئی واقف نہ تھا سو ملاقاتی کا سن کے ہمیں حیرت ہوئی ۔ میں اُس ملاقاتی کو ملنے گیا۔کوئی پاکستانی تھا کھانا ہمیں دے گیا اور باوجود میرے

پوچھنے کے اُس نے اپنا نام نہیں بتایا اور نہ ہی کبھی دوبارہ نظر آیا۔ نجانے کون فرشتہ صفت آدمی تھا۔ دنیا میں ہر جگہ اچھے لوگ موجود ہیں اور بہت سے ایسے ہیں جو نیکی کرتے ہوئے کبھی سود و زیاں نہیں دیکھتے ۔میری دعا ہے کہ اللہ تعالی اُس پاکستانی بھائی کو دین و دنیا کی نعمتوں سے نوازے۔اس تہہ خانے میں اس کال کوٹھڑی میں قیدیوں کے درمیان چھوٹی موٹی لڑائی معمول کی بات تھی لیکن ویسے مجموعی طور پر سب اچھے تھے تعاون کرنے والے تھے۔ہمیں ابھی چونکہ ملک کی سیاسی صورتحال اور اس کی سنگینی کا علم نہیں تھا اس لئے ایک دن میں نے کہہ دیا کہ حافظ الاسد اچھا آدمی نہیں ہے۔ یہ سنتے ہی میرے قریبی قیدی زرد ہو گئے اور کانوں کو ہاتھ لگا کے توبہ توبہ کرنے لگے اور ایک نے تو اپنے ہاتھ سے میرا منہ بند کر دیا۔ میرے لئے یہ عجیب تھا کیونکہ پاکستان میں ہم سیاسی راہنماؤں سے متعلق اپنی رائے گلیوں میں بھی سناتے پھرتے ہیں لیکن یہاں معاملہ اور تھا میرے ایک عربی قیدی دوست نے مجھے خبردار کیا کہ آئیندہ ایسا لفظ منہ سے نہ نکالنا ورنہ تمہارا آخری سانس بھی اسی جیل میں نکلے گا۔اُس نے ڈرتے ڈرتے بتایا کہ جس دفتر میں جس گھر میں جس کار میں حافظ الاسد کی تصویر نہ لگی ہو اُس گھر کے سربراہ کو یا قید کر لیا جاتا ہے یا ہمیشہ کے لئے وہ غائب کر دیا جاتا ہے ۔اس جیل کی طرح بہت سی جیلیں صرف دمشق میں ہیں ۔اس نے بتایا کہ اسی جیل میں کئی ایسے کمرے ہیں جن میں حکومت کے باغی دس دس پندرہ پندرہ سالوں سے قید تنہائی کاٹ رہے ہیں ۔اور کئی ایسے ہال ہیں جن میں سینکڑوں قیدی بند ہیں جنہیں دن میں صرف ایک روٹی دی جاتی ہے اور وہ ڈھانچے بن چکے ہیں۔ میں نے اُسے بتایا کہ میں نے ایک ہال میں ایسے لوگ دیکھے ہیں جو ڈھانچے بن چکے ہیں اُس نے کہا یہاں دمشق میں کتنے ہی نجی عقوبت خانے ہیں جہاں سیاسی قیدیوں کو بھوکا رکھ کے مارا جاتا ہے۔ اسنے بتایا کہ خود اُسنے اپنی ٹیکسی میں حافظ الاسد کی تصویر نہیں لگائی ہوئی تھی اُسکی ایک پولیس والے سے

اس موضوع پر اور رشوت نہ دینے پر لڑائی ہوگئی جسکی وجہ سے اُسے حکومت دشمن قرار دیا گیا اور اب وہ چھ سال سے اسی عمارت کے مختلف کمروں میں قید ہے اس نے بتایا کہ جب اُسے پکڑا گیا تھا تو پلائر کے ساتھ اُسکے ہاتھوں اور پاؤں کے بیس کے بیس ناخن کھینچ لئے گئے تھے۔ اُسنے بتایا کہ ایک دن اسکے سامنے چھت پر ایک ملزم کو شدید تشدد کا نشانہ بنایا گیا اور پھر پانچویں منزل سے اُسے نیچے دھکا دے دیا گیا جہاں سے گر کے وہ ہلاک ہوگیا۔ ایک قیدی نے بتایا کہ ایک دن اُسکے سامنے چار نوجوان اُسکے کمرے میں لائے گئے اور فوجیوں نے انہیں ٹھوکریں مار مار کے اور اُن کے سر دیوار سے پٹخ پٹخ کے ہلاک کر دیا۔ خدا جانے اُنکا قصور کیا تھا۔ اس کے علاوہ اُسنے اتنے واقعات بتائے کہ میں خوف اور دہشت کے مارے دنگ رہ گیا کہ ایک اسلامی ملک میں ایسا بھی ہوسکتا ہے۔ ایک قیدی کا جب میں نے تفصیلی انٹرویو لیا تو اُس کے حالات سن کے میرے ہوش اڑ گئے اُس پہ اور اسکے گھر والوں پہ اسکے بہن بھائیوں پہ اتنا ظلم ہوا تھا کہ انہیں لکھنا کتاب کی حرمت کے خلاف ہے۔ اُس دن کے بعد میں نے خاموشی اختیار کر لی لیکن میں دل ہی دل میں دعا کر رہا تھا کہ یا اللہ ان جیلوں کو ان زندانوں کو توڑ دے جس میں بے گناہ لوگوں کو اذیتیں دی جارہی ہیں۔ حافظ الاسد کی حکومت نے اس وقت اپنے تمام مخالفین کو سیاسی قیدی بنایا ہوا ہے اور زیادہ امید یہی ہے کہ یہ سیاسی قیدی اُس وقت رہا ہوں گے جب انہیں اپنی ہوش نہیں ہوگی لیکن ان کے بچے آزاد ہیں کسی نہ کسی دن وہ اس کے خلاف بغاوت ضرور کریں گے۔ اس طرح خوفزدہ کر کے کچھ سال تو لوگوں کو خاموش رکھا

جاسکتا ہے یا شاید کچھ سو سال خاموش رکھا جا سکتا ہے لیکن ہمیشہ کے لئے نہیں۔ کچھ قیدی تسلیم کرتے تھے کہ ہم لوگ اتنے بے قابو ہو چکے ہیں کہ ہمیں ایسے ہی حکمران چاہیں اور ان ممالک میں کوئی نرم دل حکمران کامیاب نہیں ہو سکتا۔ ایک قیدی غالباً عراق کا رہنے والا تھا اسنے بتایا کہ عراق میں بھی یہی صورتحال ہے اور وہاں صدام حسین کے مخالفین کو زیر زمین رکھا جاتا ہے اور اُسکے بڑے بیٹے ''اودی'' نے اودھم مچایا ہوا ہے۔ یہ سب باتیں میں نے وہاں قیدیوں سے سنیں۔ کیا سچ ہے اور کیا جھوٹ ہے اور کون ظالم ہے اور کون مظلوم یہ صرف اللہ تعالی کی ذات ہی بہتر جانتی ہے میں صرف جیل میں قیدیوں سے حاصل معلومات آپ جیسے آزاد لوگوں کو پہنچا رہا ہوں۔ یہ قیدی عام طور پہ کوئی معلومات دینے سے گھبراتے تھے لیکن میں نے انہیں اعتماد میں لے کے اور انہیں یقین دلا کے کہ میں صحافت کا طالبعلم ہوں اور یہ باتیں اپنے ملک واپس جا کے کسی طرح لکھنا چاہتا ہوں، اُن سے یہ معلومات حاصل کیں۔ اقوام متحدہ کو شائد ان تہہ خانوں کا علم نہیں ہے یا شاید وہ کسی مصلحت کے تحت خاموش ہیں خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ اگر اس جیل سے چھوٹ گیا تو آزاد لوگوں کے نام ایک خط ضرور لکھوں گا اور انہیں کہوں گا کہ اگر آپ دمشق کی جیل میں نہیں ہیں تو سمجھئے کہ آپ جنت جیسی جگہ میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ کیا آپ اپنی مرضی سے اُٹھ بیٹھ سکتے ہیں۔ کیا آپ چند گز تک اپنی مرضی سے ٹہل سکتے ہیں کیا آپکو دال روٹی کھانے کو میسر ہے۔ اگر آپ کا جواب ہاں میں ہے تو یقین کریں آپ جنت میں بیٹھے ہوئے ہیں ناشکری نہ کریں۔ پھر سوچئے کیا آپ کو پانی پینے کے لئے ٹائلٹ میں جا کے ٹونٹی سے منہ لگا کے پانی پینا پڑتا ہے۔ کیا آپ پچھلے چوبیس گھنٹے سے بھوکے ہیں۔ کیا آپکے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ہیں۔ کیا آپ ایک ایسے کمرے میں بند ہیں جس میں چالیس پچاس مجرمان یا ملزمان بند ہیں اور سگریٹ نوشی کر رہے ہیں۔ اگر آپ کا جواب ہے ''نہیں'' تو میں آپکو یقین دلاتا

ہوں کہ آپ جنت میں بیٹھے ہوئے ہیں۔صحت و تندرستی خیر و عافیت اور سوچ اور عمل کی آزادی جنت جیسی نعمتیں ہیں ان کی قدر کریں۔اسی جیل میں، میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ یہ تو سلاخوں والی جیل ہے بہت سی ایسی جیلیں بھی ہیں جو سلاخوں کے بغیر ہیں۔ہم میں بہت ہے جو اپنی خواہشوں کے قیدی ہیں، اپنے نفس کے قیدی ہیں اور اپنے ہی بنائی ہوئی مجبوریوں کی جیلوں میں قید ہیں۔ بہت سے اپنے ضمیر کے قیدی ہیں ۔کئی مزدور اپنے آجروں کی قید میں ہیں۔کئی گھروں میں بہو بیٹیاں قیدیوں کی زندگی بسر کر رہی ہوتی ہیں اور محض اپنے والدین کی خوشی کے لئے ساری عمر ایک خاموش قید کاٹتی رہتی ہیں ۔آزادی بہت بڑی نعمت ہے یہ نعمت، یہ حق کسی سے نہ چھینئے۔ دیکھئے اور سوچئے کہ کہیں کوئی آپکی قید میں تو نہیں ہے۔سچ بات تو یہ ہے کہ اگر ہم اپنی خواہشات کے جن پر قابو پالیں تو بہت سی قیدوں سے رہائی مل سکتی ہے۔اللہ تعالیٰ نے ہماری زندگی اتنی مشکل نہیں بنائی تھی جتنی ہم نے خود اپنے لئے بنالی ہے۔ہم اپنے ہاتھوں سے دن رات اپنے لئے دکھ کی نہریں کھود رہے ہوتے ہیں ۔ہم نے قناعت کا دامن چھوڑ کے خود ہی اپنے لئے حسرتوں کے پھندے بنا لئے ہیں کہ جب تک فلاں فلاں کام نہیں ہو جائے گا ہم خوش نہیں ہو سکتے انسانی حسرتیں اور خواہشیں کبھی پوری نہیں ہو سکتیں اور دنیا کی محبت سمندر کے پانی کی طرح ہے جتنا پیتے جاؤ گے اتنا ہی پیاس بڑھے گی۔

ایک بادشاہ اپنے درباریوں اور غلاموں کے ساتھ ایک وسیع وعریض علاقے میں پھر رہا تھا جہاں حدنظر زمینیں، فصلیں باغات چشمے اور گل و گلزار مناظر تھے۔اُسنے اپنے ایک غلام کی کسی بات پہ خوش ہو کہ کہا کہ مانگو کتنی زمین مانگتے ہو۔ غلام نے کہا آپ کتنی زمین دے سکتے ہیں۔ بادشاہ نے کہا کہ یہ لو چھڑی اور اس سے زمین پر، سورج ڈوبنے سے پہلے پہلے ایک دائرہ بنالو اس دائرے میں جتنی زمین اور باغات ہوئے تمہارے۔اب غلام نے دائرہ بنانا شروع کیا اور ہر باغ کو دیکھ کے اُسکا دل چاہا کہ اُسے بھی اپنے

دائرے میں شامل کرلے یوں لالچ میں آ کے
وہ دائرہ بڑا کرتا گیا۔ سورج ڈھلنے کے قریب تھا
اب دائرہ مکمل کرنے کے لئے وقت کم رہ گیا تھا
سو اُس نے اور بھی تیز تیز بھاگنا شروع کر دیا
تا کہ زیادہ سے زیادہ جگہ کا مالک بن سکے۔ پھر
سورج ڈھل گیا وہ غلام گرتے پڑتے اُکھڑی
سانسوں کے ساتھ دوڑتے دوڑتے اُس مقام پہ
پہنچ گیا جہاں سے دائرہ شروع کیا تھا یہاں پہنچ
کے غلام گرا اور دم توڑ گیا۔ دائرہ مکمل ہو چکا تھا
بادشاہ نے درباریوں کو کہا جس جگہ یہ گرا ہے یہیں
اسکی قبر بنادو۔ اتنی سی زمین اسکی تھی یا اتنی سی زمین
کی اسکو ضرورت تھی یونہی اس نادان نے اتنی
تکلیف اُٹھائی۔ دمشق کے تہہ خانوں میں مجھے
لگا کہ ہم بھی اپنی خواہشوں کے غلام ہو کے غلام
گردشوں میں گھوم رہے ہیں۔ اپنی خواہشوں کے
دائرے بڑے کرتے جا رہے ہیں اور ہماری
موت ہم سے کچھ دور کھڑی ہماری بے سُود
مشقتوں کو دیکھ کے مسکرا رہی ہوتی ہے۔ عقلمندی کا
تقاضہ یہ ہے کہ خواہشوں کا دائرہ بڑا کرتے
ہوئے اپنی موت سے بھی مشورہ کر لیا جائے جو
اس دائرے کے اختتام پر بازو پھیلائے ہمارے
استقبال کے لئے کھڑی ہوتی ہے۔ کہتے ہیں کہ
ایک آدمی اپنے دنیا کے کاموں میں مصروف اور
مستقبل کے خواب بننے میں مصروف تھا کہ موت
کا فرشتہ سامنے آ کھڑا ہوا جسکے ہاتھ میں ایک
صندوق تھا۔ موت کے فرشتے نے کہا چلو بھائی
زندگی تمام ہوگئی ہے۔ اُس آدمی نے خوفزدہ اور
اُکھڑی ہوئی سانسوں سے کہا کہ تم نے مجھے کوئی
وارننگ نہیں دی ابھی تو میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا
کہ تم آ جاؤ گے ابھی تو میرے سارے کام
میرے سارے خواب ادھورے ہیں ۔ موت
کے فرشتے نے کہا کہ ہر روز دنیا میں ہزاروں لوگ
لمحوں میں لقمہ اجل بن جاتے ہیں قبرستانوں کے
شہروں کے شہر آباد ہیں اس سے بڑی اور کیا
وارننگ دیتے۔ اُس آدمی نے کہا کہ میرے بیوی
بچے میرے بغیر کچھ نہیں کر سکتے وہ غم سے مر
جائیں گے۔ فرشتے نے مسکراتے ہوئے کہا یہ
تمہارا وہم ہے۔ کوئی کسی کے بغیر نہیں مرتا اور

تمہارے بغیر بھی سارے کام ہو جائیں گے۔
اس پر اُس آدمی نے تعجب سے پوچھا کہ اس
صندوق میں کیا ہے ۔ فرشتے نے کہا تمہاری
جائیداد جو تمہارے ساتھ قبر میں جائے گی۔ اس
پہ اُس شخص نے پوچھا کیا اس میں میرے مکانوں
اور زمینوں کے کاغذات ہیں۔ فرشتے نے کہا کہ
وہ مکان وہ زمینیں کبھی بھی تمہاری نہیں تھیں تمہیں
دھوکہ لگا ہوا تھا تم صرف اُنکے چوکیدار تھے۔ تو
پھر اس صندوق میں میری کونسی جائیداد ہے آدمی
نے پوچھا۔ فرشتہ کہنے لگا اس میں وہ ہے جو تم نے
اچھے کام کئے جو نیک اعمال آگے کے لئے جمع
کئے اور افسوس کہ تمہارا یہ صندوق خالی ہے اور
یہ آخری فقرہ تھا جو تم نے اس دنیا میں سنا۔

یہ تو ایک کہانی تھی لیکن حقیقت یہی ہے کہ ہم
انسانوں نے سادگی کی زندگی چھوڑ کے اپنے لئے
بڑی بڑی مشکلات پیدا کر لی ہیں۔ اور بہت سے
حکمران ہیں جو اپنی کرسی اور اقتدار پر قابض
رہنے کے لئے بڑے ظلم ڈھا رہے ہیں اور صرف
اس خوف سے کہ کسی دن وہ قتل نہ ہو جائیں
سینکڑوں لوگوں کا خون کر رہے ہیں۔ واپس تہہ
خانے میں چلتے ہیں۔ تہہ خانے میں موجود
ہماری جیل کی جگہ اتنی تنگ تھی کہ مجھے سانس کی
تکلیف ہو گئی۔ میرا دل چاہتا تھا کہ کسی طرح
جیل میں ہی مجھے کسی کھلی جگہ پہ دس منٹ کے لئے
لے جائیں لیکن وہاں سننے والا کوئی نہیں تھا۔
ہمارے ساتھ ایک فرانسیسی نوجوان انٹونی بھی
قید تھا جس کے متعلق قیدیوں نے ہمیں بتایا تھا کہ
وہ پچھلے کئی سالوں سے اسی جیل میں ہے۔ ہماری
رائے میں وہ پاگل تھا یا کم از کم جیل میں رہ کے
پاگل ہو چکا تھا لیکن پولیس والوں کا کہنا تھا کہ وہ
اسرائیلی جاسوس ہے اور پاگل ہونے کی
اداکاری کر رہا ہے ۔ انٹونی کوئی تیس برس کا
نوجوان ہوگا۔ کبھی صحیح باتیں کرتا تھا تو کبھی پاگلوں
جیسی حرکتیں۔ وہ جس کے پاس جا کے سونے کی
کوشش کرتا تھا سب اُس سے بھاگتے تھے یا
اُسے دھکے دیتے اور مارتے تھے۔ دراصل
اُسنے دو تین دفعہ رات کے وقت اپنے ساتھ
سوئے ہوئے آدمی کا گلہ دبانے کی کوشش کی تھی۔

ایک دفعہ ہم سوئے ہوئے تھے کہ ہمارے اوپر پانی گرنا شروع ہوگیا۔ اُٹھ کے دیکھا تو ہمارے چھوٹے سے کمرے کے بیچوں بیچ انٹونی کھڑے ہوکے پیشاب کررہا تھا اور ایسے گھوم کے کررہا تھا کہ سب کو سیراب کررہا تھا۔ عربی قیدی اُسے مارنے کو لپکے لیکن ہم نے اُسے اُن سے بچایا خود کو اور انٹونی کو صاف کیا۔ اُسے بٹھا کے جو میسر تھا کھانا کھلایا پانی پلایا اور اُسے یقین دلایا کہ کوئی اُسے نہیں مارے گا پھر وہ ہمارے درمیان تسلی سے سو گیا اور ساری رات اُسنے کسی کو تنگ نہیں کیا ۔شامی سپاہی جب بھی ہمارے کمرے میں آتے انٹونی کو ہنستے ہنستے دو تین ٹھڈے ضرور مارتے

تھے۔ بلکہ ایک دن تو ایک فوجی نے اُسے منہ پر ٹھڈے مارے جس سے اُس کا منہ لہولہان ہوگیا۔ ہم سب یہ دیکھ رہے تھے ہم انٹونی کو بچانا چاہتے تھے لیکن سب سر جھکائے خاموش بیٹھے تھے۔ اس طرح کے تکلیف دہ واقعات ہوتے رہتے تھے لیکن ایک دن حد ہوگئی۔ ایک فوجی اندر آیا اور آتے ہی انٹونی کے پیٹ میں ٹھوکر ماری۔ دروازہ کھلا رہ گیا تھا۔ انٹونی نے باہر نکلنے کی کوشش کی جس پر فوجی نے ہنستے ہوئے انٹونی کے منہ پہ ایک اور زوردار ٹھوکر رسید کی۔ انٹونی نجانے کتنے سالوں سے یہ سب کچھ سہتا آرہا تھا اُس دن اُس کا میٹر گھوم گیا۔ اُسنے اُچھل کے ایک ایسی فلائنگ کک اُس فوجی کے سینے پر ماری کہ وہ دھرا ہوگیا اور پھر دونوں گتھم گتھا ہوگئے۔

بڑی مشکل سے دونوں کو الگ کیا اور وہ شامی فوجی گالیاں نکالتا ہوا باہر نکل گیا۔ ہم سب انٹونی کے لئے پریشان ہورہے تھے۔ زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ باہر فوجی بوٹوں کی دھڑ دھڑ کی آواز سنائی دی۔ اب کی بار وہ پانچ چھ فوجی تھے انٹونی کو اُٹھا کے سامنے والے ہال کمرے میں لے گئے جہاں تشدد کیا جاتا تھا۔ ہمارے کمرے سے

باہر جھانکنے کے لئے صرف ایک مربعہ فٹ کی سلاخوں والی کھڑکی تھی جس پر پہلے ہی دوڑ کے عربی قیدی پہنچ گئے۔سچ بات ہے کہ ہمارے دل خون کے آنسو رو رہے تھے۔پھر تھوڑی ہی دیر میں جیل کی پوری عمارت انٹونی کی دلدوز چیخوں سے لرز اُٹھی ۔ پندرہ بیس منٹ کا وہ وقت ہمارے لئے بہت دشوار تھا۔بیس منٹ کے بعد وہ انٹونی کو بے ہوشی کی حالت میں کمرے میں پھینک گئے۔انٹونی کے منہ سے اور ناک سے خون بہہ رہا تھا۔اُسے بہت شدید طریقے سے

مارا گیا تھا ایک عربی جو کھڑکی میں سے دیکھنے میں کامیاب ہو گیا تھا اُسنے بتایا کہ ظالموں نے انٹونی کو ٹائر میں ایسے ڈالا ہوا تھا کہ اُسکے دونوں پاؤں اور سر بیک وقت ایک ٹائر میں تھے اور پھر اُس پر کوڑے برسائے گئے تھے۔ انٹونی میرے ساتھ بے ہوش بڑا تھا اور میں اپنے آپ کو دنیا کا سب سے بے بس انسان پا رہا تھا۔ہم انٹونی کا جسم دباتے رہے اُسکے منہ میں پانی ڈالتے رہے۔گو وہ تشدد براہ راست ہمارے جسموں پر نہیں ہوا تھا لیکن یقین کریں تکلیف اُس سے بھی زیادہ تھی۔میری اپنی حالت اُس دن غیر تھی۔بخار سے میرا جسم تپ رہا تھا،سانس لینے میں دشواری تھی اور میرے ساتھ لہو لہان انٹونی کسی دو سال کے بچے کی طرح بلک بلک کے رو رہا تھا اور نیم بے ہوش تھا۔میں سوچ رہا تھا کہ نجانے یہ کس کا بیٹا ہے کس کا بھائی ہے۔مجھے لگ رہا تھا کہ جنت دوزخ تو آخرت کی زندگی میں ہوں گی لیکن انسانوں نے اپنے ہاتھوں سے دنیا کو دوزخ ضرور بنایا ہوا ہے۔

اذیت صرف یہ نہیں ہوتی کہ آپ کے جسم پر چوٹیں ہوں بلکہ اذیت یہ بھی ہے کہ آپ کے سامنے کسی پر ظلم کیا جا رہا ہو اور آپ کچھ نہ کر سکتے ہوں سوائے خاموش رہنے کے۔ انٹونی کی

حالت اگلے دن اور بھی خراب ہوگئی۔ میرے ساتھیوں صالح، جمشیداور نصیر نے عربی قیدیوں کے ساتھ مل کے پروگرام بنایا کہ اب جب وہ فوجی جس نے انٹونی کو مارا تھا اندر آئے تو دروازہ اندر سے بند کر کے اُسے خوب مارا جائے نتائج چاہے کچھ بھی ہوں۔ انٹونی کی حالت دیکھ کے دل میرا بھی یہی چاہتا تھا لیکن میں نے اپنے دوستوں کو صبر اور دعا کی تلقین کی۔ ہمارے کچھ دوست ہم سے زیادہ اذیت میں مبتلا تھے۔ ایک دوست کی اہلیہ امید سے تھیں اور آجکل میں ماں بننے والی تھیں وہ عورتوں کی جیل میں تھیں اور پچھلے آٹھ دنوں سے کوئی رابطہ نہیں تھا۔ ایک دوست کی بزرگ والدہ جو بیمار تھیں وہ بھی عورتوں کی جیل میں تھیں۔ اسکے علاوہ دو دوستوں کے بیوی بچے عورتوں کی جیل میں تھے اور کوئی رابطہ نہیں تھا۔ سب سے زیادہ میرا وہ دوست پریشان تھا جسکی اہلیہ امید سے تھیں کیونکہ تین چار دن اوپر ہو چکے تھے۔ یہ دوست بہت ہی پیارے اور مہذب اور ہم سب سے زیادہ شائستہ آدمی تھے۔ انہوں نے بتایا کہ ایجنٹ نے انہیں کہا تھا کہ دو دنوں میں وہ جرمنی ہوں گے اس لئے وہ اس حالت میں بھی سفر پر نکل پڑے تھے۔ اگلے دن معلوم ہوا کہ اللہ تعالی نے انکی اہلیہ کو بیٹی سے نوازا ہے۔ ہم سب بہت خوش ہوئے ۔ اپنے اس دوست کو مبارکباد دی اور تسلی دی۔ اُنکا نام میں جان بوجھ کے نہیں لکھ رہا۔ تاہم اُن کے حوصلے اور صبر کی میں داد دیتا ہوں۔ بڑے صبر سے انہوں نے وقت گزارا۔ دو دنوں بعد ہمیں خبر دی گئی کہ بچی اللہ کو پیاری ہوگئی ہے اور اُسکی تدفین کر دی گئی ہے۔ ہم سب پہ یہ خبر بجلی بن کے گری۔ بچی فوت کیسے ہوگئی؟ کون تدفین کر کے آیا ہے؟ کہاں تدفین ہوئی ہے؟ ہمارے سوالوں کے جوابات کسی کے پاس نہیں تھے۔ پھر ایک روز ہمیں بتایا گیا کہ آج ہمارے گروپ کی عورتوں کو بھی بلوایا جارہا ہے اور سب کا انٹرویو ہوگا۔ صبح کوئی دس بجے کے قریب ہمیں کوٹھڑی سے نکالا گیا اور اوپر ایک کمرے میں بٹھایا گیا جہاں خواتین اور چھوٹے بچے موجود تھے۔ خواتین زاروقطار رو رہی تھیں۔

اسکے بعد ہمیں کوئی تین منزلیں اوپر لے جایا گیا۔ ہمارے ساتھ اُن خواتین کو بھی سیڑھیاں چڑھنی پڑیں جنہیں شاید دو قدم بھی نہیں چلنا چاہئے تھا۔ میرے دوست اختر کا سب سے چھوٹا بیٹا میں نے اُٹھایا ہوا تھا۔ اوپر ایک بڑے کمرے میں ہمیں دیوار کے ساتھ لگ کے کھڑا ہونے کا حکم دیا گیا۔ ہمارے ایک دوست کی اہلیہ نے کہا کہ وہ واش روم جانا چاہتی ہیں۔ دو بدتمیز قسم کے سپاہیوں نے اُسے پکڑا اور ساتھ لے جانے لگے۔ اس پہ ہم سب نے احتجاج کیا کہ ہمیں خواتین پولیس افسران نظر آرہی ہیں وہ لے کے جائیں۔ لیکن انہوں نے نہ سنا اس پر میں نے زیادہ اونچی آواز میں کہا کہ نہیں یہ صرف خاتون پولیس افسر کے ساتھ تہہ خانے میں موجود واش روم میں جائے گی۔ اس پہ ایک شامی پولیس والے نے مجھے دو تین تھپڑ رسید کئے لیکن میں نے اپنا احتجاج جاری رکھا اور کہا کہ کسی صورت میں یہ خاتون مرد پولیس والوں کے ساتھ نیچے تہہ خانے میں نہیں جائے گی۔ اتنے میں اُس خاتون کا خاوند بھی اور صالح بشارت، جمشید، نصیر وسیم سب اُن پولیس افسران کے سامنے بولنے لگے بلکہ صالح بشارت تو اُس پولیس افسر کے راستے میں آ کھڑا ہوا اور کہنے لگا کہ صرف خاتون پولیس والی ہی اسے لے کے واش روم جاسکتی ہے۔ صالح بشارت غالباً لاہور کا رہنے والا نوجوان تھا۔ دمشق میں قید کے اس سارے عرصے میں وہ ہمارے لئے حوصلے اور عزم کا باعث رہا۔ نہ کبھی خود خوف زدہ ہوتا تھا نہ کسی کو ہونے دیتا تھا بلکہ حوصلہ دلاتا تھا۔ اب ہم سارے احتجاج کر رہے تھے۔ یہ بات اُن کے لئے ناقابل قبول تھی وہ تو اُس جگہ کے فرعون تھے۔ کمرے میں ایک شور مچ گیا اور پھر بڑے افسر نے خاتون پولیس والی کو بلا کے کہا کہ اسے واش روم لے جائے۔

کمرے کا ماحول بظاہر پرسکون ہوا لیکن ہمیں معلوم تھا کہ اس خاموشی کے بعد کوئی طوفان آنے والا ہے۔ کوئی چار پانچ منٹ تک خاموشی طاری رہی۔ میں نے ابھی تک اختر کا بیٹا اُٹھایا ہوا تھا۔ سب کو دیوار کے ساتھ کھڑے ہونے کا حکم دیا گیا

پھر دو جلاد قسم کے سپاہی ہاتھوں میں ڈنڈے گھماتے ہوئے آگے بڑھے اور کمرے کے عین بیچوں بیچ مجھے لا کھڑا کیا۔ میز کی دوسری جانب بیٹھے افسر نے کچھ کہا اور مجھے معلوم ہو گیا کہ مجھ سے سختی سے پوچھ گچھ کی اجازت دے دی گئی ہے۔ ایک سپاہی نے ڈنڈا لہراتے ہوئے مجھے حکم دیا کہ میں بچہ اُسکے باپ کے حوالے کر دوں۔ کمرے کا ماحول اور پولیس والوں کے مزاج دیکھ کے مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ آج میرے لئے مشکل دن ہے۔ میں نے بچہ چھوڑنے سے انکار کر دیا۔ سپاہی نے میری کمر پر دو ڈنڈے ایسے مارے کہ میرے وجود میں ناقابل برداشت دردیں اُٹھیں۔ سپاہی چیخا بچے کو چھوڑو چھوڑو چھوڑو۔ مجھے لگ رہا تھا کہ جب تک یہ بچہ میرے پاس ہے میں بچا ہوا ہوں سو اُس سپاہی کے چیخنے چلانے اور غرانے کے باوجود میں نے بچہ نہیں چھوڑا۔ اور پھر میرے سارے ساتھی گواہ ہیں کہ یکدم ایسا ہوا جیسا فلموں اور ڈراموں میں ہوتا ہے۔ میری جان بخشی کے لئے کسی اور کو تکلیف اُٹھانے کے لئے چن لیا گیا تھا۔ اختر جس کا پھولوں جیسا بچہ میں نے اُٹھایا ہوا تھا وہ یہ منظر برداشت نہ کر سکا۔ اُسکو ایک جان لیوا قسم کا ہارٹ اٹیک ہوا اور وہ دھڑام سے بے جان تختے کی طرح زمین پر گر کے بے حس و حرکت ہو گیا۔ یہ دیکھتے ہی ہم سب تمام مصلحتوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اُسکی جانب لپکے۔ پولیس والے بھی اُسکی جانب دوڑے۔ پہلے تو وہ سمجھے کہ اختر بہانہ کر رہا ہے اور لگے گالیاں دینے لیکن اختر کی نبضیں ڈوب رہیں تھیں جیل کے ڈاکٹر کو بلایا گیا جس نے تصدیق کی کہ زندگی موت کا مسئلہ ہے فوراً ہمیں واپس تہہ خانے میں اور اختر کو بذریعہ ایمبولینس ہسپتال روانہ کیا گیا۔ اگلے دو روز ہمیں کچھ علم نہیں تھا کہ اب کیا ہونے والا ہے۔ پھر ہمیں بتایا گیا کہ کل پھر سب کے انٹرویو ہوں گے تیار رہیں۔

وہ ساری رات میں خوف کے مارے سو نہ پایا۔ اگلے دن وہی کمرہ تھا لیکن ایک تبدیلی تھی۔ وہ یہ کہ پاکستانی ایمبیسی سے کوئی آدمی آیا ہوا تھا۔

ہمارے باہر والے دوست تبارک نے پاکستانی ایمبیسی کو خبر کردی تھی اور شامی پولیس سے اُنکا رابطہ ہوگیا تھا۔تفتیش کے دوران ہم نے ایمبیسی کے آدمی کو ساری بات بتائی جس پر اُسے یقین ہو گیا کہ ہم تو خود مظلوم ہیں۔اُس نے شامی پولیس کی تسلی کروادی اور پھر ہمیں تسلی دی کہ اب شامی پولیس کو یقین ہوگیا ہے کہ ہم سب پاکستانی ہی ہیں ہم میں سے کوئی اسرائیلی جاسوس نہیں ہے اور نہ ہی اصل ایجنٹ ہم میں موجود ہے۔ ہمارے سُوٹ کیس اور ہمارا سارا سامان بھی ہوٹل سے منگوا کے چیک کرلیا گیا تھا اور سارے شواہد ہمیں بے قصور ثابت کر رہے تھے۔ہمیں بتایا کہ کل ہمیں عدالت میں پیش کیا جائے گا۔

ہمارے لئے یہ خوشی کی اتنی بڑی خبر تھی کہ اُس دن جب ہم اپنی کوٹھڑی واپس پہنچے تو ہمیں لگا کہ ہم کسی فائیو سٹار ہوٹل میں آ گئے ہیں۔سب نے خوب پیسے نکال کے بہترین کھانا منگوایا۔ سپاہیوں کو پیسے دے کے قہوے کا آڈر کیا خود بھی پیا اور سب کو پلایا۔نصیر نے اپنی خوبصورت آواز میں سہگل کا وہ دردناک گانا سنایا ؎

اے کاتب تقدیر مجھے اتنا بتا دے
کیوں مجھ سے خفا ہے تُو، کیا میں نے کیا ہے

ایک اور پاکستانی شخص جو کئی سالوں سے دمشق کے تہہ خانوں میں قید تھا اُسکی آواز بہت اچھی تھی اُسنے ہمیں پاکستان کے ملی نغمے سنائے جنہیں سن کے دل غم سے بھر گیا کہ واقعی ہمارا اپنا دیس ہمارا وطن کتنا خوبصورت ہے اس کے لوگ کتنے خوبصورت اور محبت کرنے والے ہیں لیکن بعض مفاد پرست مذہبی دکانداروں اور سیاسی شعبدہ بازوں نے ہمارے وطن کا چہرہ اس طرح بگاڑ دیا ہے کہ لگتا ہی نہیں ہے کہ یہ وہ ملک ہے جسکا خواب ہمارے بزرگوں نے دیکھا تھا۔ ایسے حالات سے تنگ آ کے مجھ جیسے کئی نوجوان دیار غیر کو نکل جانے کا سوچتے ہیں اور راستوں میں ایسی تکلیفیں اُٹھاتے ہیں جن سے ہم گزر رہے تھے۔اس جیل میں اپنے گروپ میں نے ابھی تک بشارت صالح، جمشید، نصیر اور اشرف کاکے کا ذکر کیا ہے اسکے علاوہ بھی ہمارے کچھ دوست

تھے۔بعض کا نام مصلحتاً نہیں لکھ رہا۔ایک تھے وسیم صاحب۔وسیم دبلے پتلے جسم کا لیکن بہت صابر نوجوان تھا۔کھانا ملے نہ ملے نماز اُسنے وقت پہ پڑھنی ہوتی تھی۔ پریشانی اُسے چھو کے نہیں گئی تھی۔جیل میں وہ ایسے مزے سے رہتا تھا جیسا اُسے پتہ ہو کہ یہ تو پہلے سے ہی تقدیر میں لکھا ہوا تھا۔جس طرح میں ہر موقع پر دوستوں کو کہتا تھا کہ شائد اس میں بھی خدا کی کوئی بہتری ہوگی۔ وسیم بھی ہر وقت صبر کی تلقین کرتا تھا۔ایک دو دوست تھے جو ہمیں خوفزدہ کرنے میں پیش پیش تھے اور کہتے رہتے تھے کہ شاید اب ہم اسی جیل میں دم توڑیں گے۔

اس جیل میں اور بہت کچھ دیکھنے کو ملا۔ بہت سے واقعات میں جان بوجھ کے نہیں لکھ رہا۔یہ بھی ممکن ہے کہ شام کے لوگ بہت پیارے ہوں وہاں بہت انصاف ہو۔ وہاں کی حکومت بہت اچھی ہو وہاں کا نظام بہت اچھا ہو اور رعایا حافظ الاسد سے بہت پیار کرتی ہو لیکن بدقسمتی سے ہمیں صرف ملک شام کا صرف تاریک پہلو ہی دیکھنے کو ملا تھا۔بات ہو رہی تھی جیل کی تو کچھ ہی دنوں میں جیل میں ہم عربی قیدیوں سے گھل مل گئے اور ٹوٹی پھوٹی انگلش اردو عربی میں ایک دوسرے کو لطیفے سناتے تھے ایک روز صبح صبح دروازہ کھلا اور مجھے اور میرے ایک ساتھی نصیر کو باہر بلایا گیا۔ہمیں ایک بڑے ہال کے سامنے لے گئے اور بتایا کہ اسکے اندر کوئی گٹر بلاک ہو گیا ہے جسکی وجہ سے سارا ہال پانی سے بھر گیا ہے ہمیں اُس ہال میں گٹر کھولنا ہے۔ یہ کہہ کے ہم دونوں کو اس تاریک ہال میں بھیج دیا گیا جس میں گھٹنے گھٹنے بدبودار اور سیاہ پانی کھڑا تھا۔ہال میں بہت مدھم روشنی تھی۔اوپر ہمیں بجلی کے پرانے پرانے میٹر اور تاریں نظر آرہی تھیں۔اندھیرا اتنا تھا کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو بمشکل دکھائی دیتے تھے۔ ڈرتے ڈرتے ہم نے ٹراؤزر اوپر کئے اور ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کے ہال کے گندے پانی میں پاؤں ڈال دیئے۔انہوں نے ہمیں بتایا تھا کہ ہال کے چاروں کونوں میں گٹر کے پائپ ہیں اور ان میں سے کوئی ایک یا سارے ہی بلاک

ہیں۔ہال کو باہر سے بند کر دیا گیا تھا اور اب ہم دو دوست ایک تاریک ہال میں گٹر کی تلاش میں تھے ساتھ ساتھ ہم ہنس بھی رہے تھے اور میں نصیر کو چھیڑ رہا تھا کہ اور جاؤ جرمنی۔ایک دو بار ہم پھسلے اور سر سے پیر تک پانی میں شرابور اور کالے ہو گئے۔کوئی ایک گھنٹے کے بعد آخر کار ہم وہ بلاک گٹر کھولنے میں کامیاب ہو گئے اور اتنے خوش ہوئے گویا ہم نے مریخ پر راکٹ اُتار لیا ہے۔نصیر صاحب بڑے فخر سے کہہ رہے تھے کہ میرے علاوہ کوئی یہ گٹر نہیں کھول سکتا تھا۔ بہر حال گٹر کھولنے کے بعد ہال کے صفائی کرتے رہے پھر دروازہ اندر سے پیٹتے رہے کہ بھائی ہمیں باہر نکالو۔آخر انہوں نے ہمیں باہر نکالا نہانے کو جگہ دی۔پھر وہ دن بھی آ گیا جب ہمیں اس عمارت سے نکال کے فوجی ٹرک میں ڈالا گیا اور عدالت لے جایا گیا۔اُس سارا دن ہماری پیشی کی باری ہی نہیں آئی۔بھوک سے سب کا بہت برا حال تھا۔پھر لاک اپ میں سردی بہت زیادہ تھی۔اس سے پہلے ہم تہہ خانے میں تھے اور ایک کمرے میں کوئی چالیس لوگ تھے اس لئے اس یخ بستہ سردی سے پالا نہیں پڑا تھا۔ یہاں ہم عام گراؤنڈ فلور پر تھے اور سردی کے جھونکے ہمیں منجمد کر رہے تھے۔دن بھر تبارک ہمارے ساتھ عدالت میں رہا اور ہمیں تسلیاں دیتا رہا۔چھ بج گئے۔عدالت کی لائٹیں آف ہونا شروع ہو گئیں۔تبارک کہیں رفو چکر ہو گیا۔پولیس والے آئے ہمیں کہا کل عدالت میں حاضری ہو گی۔کل تک یہیں کہیں لاک اپ میں رہنا ہو گا۔وہاں سے ہمیں نکال کے اُس سے بھی زیادہ ٹھنڈے سلاخوں والے کمرے میں بند کر دیا گیا۔اس بڑے سے ہال کمرے کے ایک طرف دیوار تھی اور باقی تین اطراف میں سلاخیں تھیں۔جوں جوں شام بڑھتی گئی سردی کی شدت میں اضافہ ہونا شروع ہو گیا۔سردی سے زیادہ ہمیں بھوک ستا رہی تھی۔ ہمارے ساتھ کوئی پندرہ بیس شامی ملزمان بھی بند تھے۔اُنکے عزیز جاتے جاتے انہیں کوئی روٹی وغیرہ دے گئے تھے۔ہمارے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔سو صبر کر کے

ہم خاموش بیٹھ رہے۔ یہ کمرہ کافی بڑا تھا اور عین ہواؤں کی زد پہ تھا جسکی وجہ سے سردی بڑی تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ ہمارے ساتھ والے کمرے میں ایک ماں بیٹی کو بھی قید کیا گیا تھا۔ دونوں کمروں کے درمیان سلاخیں تھیں یا یوں کہہ لیں کہ ایک بڑے ہال کو سلاخیں لگا کے دو کمرے بنائے گئے تھے۔ اُسکی بیٹی کوئی سولہ سترہ سال کی خوبصورت اور معصوم لڑکی تھی اور خوف کے مارے دونوں ماں بیٹیاں ہمارے قریب لیکن سلاخوں کے دوسرے پار بیٹھیں تھیں حقیقت بات ہے کہ خود سے زیادہ اُن پہ ترس آ رہا تھا کہ وہ کیوں اس مشکل میں گرفتار ہیں۔ آہستہ آہستہ سردی ہمارے بس سے باہر ہونا شروع ہوگئی اور ہم باقاعدہ ٹھٹھرنے لگے۔ سردی سے بچنے کے لئے ہم نے ہال میں ایک کونے سے دوسرے کونے میں دوڑ لگانا شروع کی جس سے وقتی طور پر جسم گرم ہو گئے۔ ان شامیوں کے پاس دو تین کمبل بھی تھے لیکن ہمارے پاس کمبل وغیرہ نہ تھا۔ آہستہ آہستہ ہم سب تھک گئے اور ایک کونے میں لیٹ کے سونے کی کوشش کرنے لگے۔ رات کے کوئی ایک دو بجے کا عمل ہوگا کہ دروازہ کھلنے کی آواز سے ہم چوکنا ہو گئے۔ تین چار سپاہی اندر داخل ہوئے اور ان ماں بیٹی کی طرف بڑھے۔ لڑکی اور اُسکی ماں نے زارو قطار رونا شروع کر دیا۔ سپاہیوں نے لڑکی کو بازو سے پکڑا اور باہر کو گھسیٹنے لگے۔ شامی قیدی اور ہم سب معاملے کی سنگینی جان گئے اور کھڑے ہو کے ان سپاہیوں کو برا بھلا کہنے لگے۔ شامی قیدیوں کو پولیس والوں نے بتایا کہ ہم اس لڑکی کو تفتیش کے لئے لے کر جا رہے ہیں۔ شامی قیدیوں نے اور ہم سب نے خوب شور مچایا کہ آپ اس وقت اسے یہاں سے نہیں لے کے جا سکتے۔ عدالت تو کل صبح لگے گی۔ ہمارے بھرپور احتجاج اور شور شرابے کے باوجود اُن درندہ صفت سپاہیوں کے آگے ہماری کچھ پیش نہ گئی اور وہ اُس معصوم سی شامی لڑکی کو اپنے ساتھ لے گئے اور کوئی دو گھنٹوں کی تفتیش کے بعد اُسے نیم بے ہوشی کی حالت میں پھینک گئے۔ ایک بھوک دوسرے

جسم کو کاٹ دینے والی سردی اُس پر ہماری آنکھوں کے سامنے بے بس انسانیت کی ایسی تذلیل ۔ وہ رات بہت مشکل تھی لیکن پھر بھی نجانے کیسے مجھے نیند آ ہی گئی ۔ ابھی میری آنکھ لگے کچھ ہی دیر ہوئی ہوگی کہ ایک شور سے میری آنکھ کھل گئی ۔ معلوم ہوا کہ بے پناہ سردی کے باعث ہمارے دوستوں نے عربیوں سے کمبل چھین لیا تھا اور اب گھونسوں اور ٹکروں کا آزادانہ استعمال ہو رہا تھا۔ پہلے پہل دو دو تین تین کی لڑائی تھی لیکن تھوڑی ہی دیر میں یہ لڑائی دو ملکوں کی غیرت کی لڑائی کی شکل اختیار کر گئی ۔ پہلے پہل میں نے لڑائی چھڑوانے کی کوشش کی کیونکہ سراسر ہمارا قصور تھا لیکن لڑائی چھڑوانے کے دوران ایک شامی نوجوان نے میرے سر میں بھرپور مکہ مارا جس کے بعد مجھے یقین ہو گیا کہ اب دفاع واجب ہو گیا ہے۔ میں نے بھی اپنے دوستوں کا ساتھ دینا شروع کر دیا۔ میں لڑنا نہیں چاہتا تھا لیکن اُس وقت مجھے یقین ہو گیا کہ اگر میں اس وقت نہ لڑا تو بعد میں یار لوگوں کی طرف سے مجھ پر غداری کا الزام آ سکتا ہے۔ چنانچہ میں نے اپنے ساتھیوں کا بھرپور ساتھ دیا اور یوں وطن عزیز سے محبت کا حق ادا کیا۔ میری حالت ایسی تھی جیسے جنگ میں امریکہ کا ساتھ پاکستان کو دینا ہی پڑتا ہے۔ دو منٹ کے بعد لڑائی رسہ کشی بلکہ کمبل کشی میں تبدیل ہو گئی یہاں ایک بار پھر میں نے اپنے دوستوں کو کہا کہ کمبل چھوڑ دو یہ ہمارا نہیں ہے اور ہم ناحق اُن کو تنگ کر رہے ہیں چنانچہ اپنا کمبل لے کر وہ بھی لیٹ گئے اور ہم بھی لیٹ گئے۔ لیٹے لیٹے انتاکشری کی صورت دونوں جانب سے سخت الفاظ کا تبادلہ جاری رہا۔

نیند کسی کو بھی نہیں آئی تھی۔ سردی اپنے عروج پر پہنچ گئی اور پھر کوئی ایک دو گھنٹے بعد اشرف کاکے نے جا کے ایک شرارتی بندر کی طرح جھپٹا مار کے کمبل اُن سے پھر اُتار لیا۔ اُن میں بھی اب

لڑنے کی سکت نہیں تھیں اس لئے انہوں نے لیٹے لیٹے عربی میں ہمیں کچھ سنایا۔ایک کمبل میں ہم نو دوست سو گئے۔ ہر کسی کے جسم پہ کم از کم دس ٹانگیں ضرور تھیں۔ایک دو گھنٹوں بعد میری آنکھ کھلی تو پتا چلا کہ کمبل ایک بار پھر اپنے مالک حقیقی سے جا ملا ہے اور ہمارے جسم سردی کی شدت سے اکڑوں ہو چکے ہیں۔بہت مشکل وقت تھا۔جتنا آپ سوچ رہے ہیں اس سے کچھ زیادہ۔ اگلے روز عدالت لگی ۔ ہمارا ترجمان تبارک ٹھہرا۔اُسنے کمرہ عدالت تک جاتے ہوئے کہا کہ ہزاروں روپیہ بطور رشوت جج کو دے دیا گیا ہے اسکے علاوہ جج کی فرمائش پہ نیا ٹی وی اور فرج اُسکے گھر بجھوا دیا گیا ہے اسلئے آج ہم ضرور چھوٹ جائیں گے۔ پتا نہیں اُسنے ایسا کیا تھا یا نہیں لیکن اُسکا یہ بیان تھا۔اس نے یہ بھی کہا کہ جب میں آپ سے کوئی سوال پوچھوں تو جواب میں کچھ بھی ضرور کہیں۔ آگے موقع کی مناسبت سے ٹرانسلیشن وہ خود کرے گا۔ ایک طویل انتظار کے بعد ہماری بھی باری آ ہی گئی اور ہم ہتھکڑیوں میں جج کے سامنے پیش ہوئے۔ جج نے پوچھا کہ تم یہاں کیا کرنے آئے تھے۔ ہمارے ایک ساتھی نے جو گاؤں کا رہنے والا، ہٹا کٹا اور اکھڑ قسم کا تھا اور بس ڈرائیور تھا شام کی پولیس کو پانچ چھ مناسب قسم کی گالیاں دیں۔ تبارک نے جج کو کہا کہ یہ کہہ رہا ہے آپکا خوبصورت ملک دیکھنے آئے تھے جج کے چہرے پر مسکراہٹ اور طمانیت پھیل گئی۔ اشرف کاکے، کو اپنے اوپر بلا کا کنٹرول تھا۔ جب اُس سے پوچھا کہ کیا کرنے آئے تھے تو اُسنے کہا'' تیرے گنجے سر پر جوتیاں مارنے کو دل چاہتا ہے'' تبارک نے پتہ نہیں اسکی کیا ٹرانسلیشن کی کہ جج نے مطمئن ہو کے اثبات میں سر ہلایا ۔ باری باری ہر ایک کا انٹرویو ہوا۔ترجمانی تبارک نے نہائت احسن رنگ میں کی جج بڑا متاثر لگ رہا تھا۔اُسنے کہا کہ انہیں دوبارہ عدالت میں پیش کیا جائے۔اُس روز ہمیں ایک بار پھر ہتھکڑیاں لگا کے فوجی ٹرک میں پھینکا گیا اور اس بار ہمیں دمشق کی مرکزی جیل غالباً

المدرہ بجھوادیا گیا۔ یہ جیل تھی یا کوئی شہر تھا شائد کوئی چھ سات ہزار کے قریب قیدی ہوں گے۔ اس جیل میں کئی بلاک تھے۔ ہر بلاک میں آگے کئی کئی راہداریاں تھیں۔ ہر راہداری میں اندازاً کوئی تیس تیس کمرے تھے اور ہر کمرے میں کوئی پچاس ساٹھ قیدی تھے۔سب سے پہلے ہمیں ایک مولوی صاحب کے پاس لے جایا گیا جنہوں نے عربی زبان میں ہمیں لیکچر دیا۔ ہمیں سمجھ نہیں آئی لیکن حضرت یوسف علیہ السلام کا نام سن کے سمجھ میں آیا کہ وہ کہہ رہے تھے کہ نبیوں پر بھی مشکل کے وقت آتے رہے ہیں اور یہ جیل اپنی اصلاح کرنے کی جگہ ہے۔ ویسے یہ جیل اتنی صاف ستھری اتنی منظم تھی کہ میں اسکی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ لیکچر کے بعد ہمیں ڈائننگ ہال لے جایا گیا۔ ہمیں کھانا دیا گیا۔ کھانے کے لئے

ایک ایک روٹی اور ایک ایک بڑا سا ابلا ہوا آلو تھا ۔یقین کریں اُس کھانے کا اتنا لطف آیا کہ بیان سے باہر ہے اور اُس وقت یاد آیا کہ ہم اللہ تعالی کی نعمتوں کی کیسی ناشکری کرتے ہیں جب کہ ایک ایک لقمے پر اُسکا شکر واجب ہے۔ اُس دن وہ آلو کھاتے ہوئے اُس بزرگ کا واقعہ سمجھ آیا جب انہوں نے اپنے ایک مرید کو لڈو کھانے کا طریقہ سمجھایا تھا۔ بات کچھ یوں تھی کہ کہیں سے لڈو آئے تو مرید نے پورا لڈو اُٹھا کے منہ میں ڈال لیا اور بغیر شکریہ یا شکر ادا کئے اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ اس پر اُس بزرگ نے جنکا نام شائد حضرت جانِ جاناں تھا مسکراتے ہوئے اپنے مرید کو کہا کہ آؤ میں تمہیں لڈو کھانے کا صحیح طریقہ بتاتا ہوں۔ پھر انہوں نے لڈو کا ایک ذرہ منہ میں ڈالتے ہوئے سبحان اللہ سبحان اللہ کا ورد کیا اور بولے کہ کوئی کسان اپنی نیند قربان کر کے صبح سویرے اپنے کھیتوں میں گیا ہوگا اور اسنے اپنے بیلوں کے ذریعہ زمین میں ہل پھیرا ہوگا پھر گنے کو کاشت کیا ہوگا اور فصل پکنے تک فصل کی

حفاظت کرتا ہوگا صرف اسلئے کہ اس سے تیار ہونے والی چینی سے جانِ جاناں ایک لڈو کھا لے۔ وہ بزرگ لڈو کا ایک ذرہ منہ میں ڈالتے اور سبحان اللہ سبحان اللہ کا ورد کرتے ہوئے بتاتے جاتے کہ کسطرح آگ کے قریب کھڑے ہوکے کسی نے گنے کے شیرہ کو چینی میں بدلا ہوگا کسطرح یہ چینی مزدور اُٹھا کے دکانوں پہ لائے ہوں گے کس طرح حلوائی نے آگ کے قریب کھڑے ہوکے اور مشقت اُٹھا کے لڈو بنائے ہوں گے صرف اسلئے کے جانِ جاناں ایک لڈو کھائے۔ سبحان اللہ سبحان اللہ۔ سو اُس دن دمشق کی اُس جیل میں جب بھوک انتہاء پہ پہنچے کے بعد مجھے ایک ابلا ہوا آلو ملا تو میں آلو کھاتے ہوئے سبحان اللہ سبحان اللہ کہہ رہا تھا۔

کھانے کے بعد ہمیں قیدیوں کے کپڑے پہننے کے لئے دیئے گئے اور پھر ہم سبکو دو دو کر کے مختلف کمروں میں بجھوا دیا گیا۔ مجھے اور نصیر کو ایک کمرے میں بجھوایا گیا تھا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی ہماری خوشی کی انتہاء نہ رہی کمرے میں

دونوں اطرف دو دو منزلہ لوہے کے بیڈ لگے ہوئے تھے۔ اندر آزادی تھی قیدی ایک جگہ سے دوسری جگہ جا سکتے تھے۔ کئی قیدی مختلف گروپوں میں بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔ ہم جو پچھلے پندرہ دنوں سے فرش پہ اور تہہ خانے کی کوٹھڑی میں بند تھے ہمیں یہ جگہ کوئی پر تعیش ہوٹل سے کم نہیں لگ رہی تھی۔ ہر کمرے کا ایک امیر مقرر تھا اور سب پر اُسکی اطاعت واجب تھی۔ ہمارے کمرے کا امیر ایک انتہائی سفاک دکھائی دینے والا شخص تھا ور متعدد افراد کے قتل کے جرم میں عمر قید کاٹ رہا تھا۔ کمرے میں اُسکی عزت بلکہ دہشت تھی۔ قیدیوں نے اشاروں سے ہمیں بتایا کہ جا کے اُسے سلام کرو۔ ہم دونوں اُس کے پاس گئے ملے اور اپنی کہانی سنانے کی کوشش کی۔ اُسنے

اپنے تھرموس میں سے چائے دی اور بتایا کہ اُس کے ہوتے کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اتنے معزز اور چھٹے ہوئے بدمعاش کی دوستی ہمارے لئے کسی اعزاز سے کم نہ تھی چنانچہ ہم بھی کچھ سینہ تان کے بیٹھ گئے اور اُس سے فری ہونے کی کوشش کی۔ میں نے اشاروں سے اُس سے پوچھا کہ ہم نے کس بیڈ پہ سونا ہے۔ یہ سُن کے اُس نے قہقہے لگانے شروع کر دیئے نصیر اور میں بھی بلاوجہ اور اُسے خوش کرنے کے لئے اُسکے ساتھ ہنسنے لگے۔ وہ اپنی ہنسی کو ضبط کرتے ہوئے بولا کہ تین چار سال نیچے فرش پہ سونا ہوگا اور پھر بیڈ ملے گا۔ اب ہماری ہنسی یکدم کھانسی میں تبدیل ہوگئی کیونکہ ہمیں اُسکا یہ مذاق پسند نہ آیا تھا۔ میں نے اُسے کہا کہ ہم تو آئے ہی صرف دو دنوں کے لئے ہیں۔ یہ سن کے اُسے ایک بار پھر ہنسی کا دورہ پڑ گیا کہنے لگا ہم سب بھی یہاں دو دو دن کے لئے ہی آئے تھے۔ اب ہمیں بیس بیس سال ہونے کو آئے ہیں۔ یہ سُن کے ہمارے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔

چار و نا چار دو بیڈوں کے درمیان والے فرش پر بغیر تکیے بغیر چادر بغیر کمبل کے لیٹ گئے۔ دو تین دنوں میں ہم اس جگہ کے خوب عادی ہو گئے۔ دو وقت کھانے کے لئے گھنٹی بجتی تھی سارے قیدی اپنے اپنے کمروں سے نکل کے ڈائینگ ہال کے باہر جمع ہو جاتے تھے اور ایک دوسرے کو خوب دھکے لطف اندوز ہونے کے لئے دیتے تھے۔ سچ بات ہے کہ میں بھی دھکے دینے والوں میں پیش پیش ہوتا تھا اور ہجوم میں جان بوجھ کے ہاتھ لمبا کر کے کسی کے چپت رسید کرتا اور پھر دونوں کی تکرار سن کے لطف اندوز ہوتا۔ بوریت دور کرنے کے لئے کچھ تو کرنا تھا۔ ڈائننگ ہال کا دروازہ کھلتا تو سب کھانے پر ٹوٹ پڑتے۔ کھانے کے لئے اندازاً دس منٹ کا وقفہ ہوتا تھا۔ کھانا ظاہر ہے بہت ہی سادہ ہوتا تھا۔ اکثر روٹی اور عجیب بے ذائقہ سی دال ہوتی تھی۔ تھوڑی دیر میں ہی کھانا ختم ہونے کی گھنٹی بجتی تھی اور ہم ایک آدھ روٹی قمیض میں چھپا کے ساتھ لے آتے اور بے وقت بھوک لگنے پر کھاتے اور اللہ کا شکر ادا کرتے۔

ہمارے کمرے میں بڑے بڑے اداکار قسم کے قیدی تھے۔ ایک قیدی تو اپنی حرکتوں سے ہنسا ہنسا کے دہرا کر دیتا تھا۔ میرا دوست نصیر ہمدم بڑا خوش اخلاق قسم کا اور بڑا زندہ دل آدمی تھا۔ نظم پڑھنے میں اور گانے میں اُسکی آواز بہت سریلی تھی سو جلد ہی وہ سارے کمرے میں مقبول ہو گیا جبکہ جتنے ادبی قسم کے قیدی تھے وہ سب میرے دوست بن گئے۔ حیرت کی بات تھی کہ دو دنوں میں ہی نصیر کے وہ لوگ دوست بن گئے جو طاقت آزمائی اور کلائی پکڑنے جیسے کاموں میں دلچسپی رکھتے تھے اور شعر و ادب سے دلچسپی رکھنے والے میرے دوست بن گئے۔ سچ کہتے ہیں کبوتر بہ کبوتر، باز بہ باز۔ اس جیل میں مجھے بعض اوقات نماز باجماعت پڑھانے کا بھی موقع ملا۔ خوب اچھا وقت کٹتا تھا۔ ان قیدیوں میں زیادہ تر عادی مجرم تھے۔ یہاں رہنے کے دوران بڑی معلومات حاصل ہوئیں۔ ہمیں بتایا گیا کہ اس جیل میں کئی ایسے حصے ہیں جہاں سیاسی قیدی ہیں اور اُس حصے کی طرف دیکھنے کی بھی اجازت نہیں ہے۔ اُن قیدیوں کو دن میں ایک روٹی اور ایک آلو دیا جاتا ہے۔ ایک قیدی نے بتایا کہ اس جیل میں تیس فیصد قیدی سیاسی قیدی ہیں۔ اگر پولیس کو پتہ چل جائے یا صرف شک ہی پڑ جائے کہ فلاں شخص حافظ الاسد کا حامی نہیں ہے تو اُسے کسی جھوٹے کیس میں قید کر لیا جاتا ہے اور اکثر اُس وقت رہا کیا جاتا ہے جب وہ ہوش و حواس سے بیگانہ ہو جاتا ہے۔ وہاں ہمارے ساتھ ایک پاکستانی نوجوان غالباً اشرف بھی قید تھا۔ اُسنے بتایا کہ میرے بوڑھے والدین کو پاکستان میں یہ ہی پتا ہے کہ میں امریکہ میں رہتا ہوں جبکہ میں دمشق کی اس جیل میں گزشتہ پانچ سالوں سے قید ہوں اور کبھی میری پیشی تک نہیں ہوئی۔ اس جیل میں قیدیوں سے ہفتے میں ایک دن کام یا بیگار یا جبری مشقت بھی لی جاتی تھی یا دوسری صورت میں ایک سو لیرا شامی کرنسی کے ادا کرنے ہوتے تھے۔ ایک دن ہماری باری بھی آ ہی گئی۔ میرے کمرے میں موجود قیدیوں نے کہا کہ مشقت کے لئے نہ جانا ورنہ پچھتاؤ گے لیکن مجھے

تجسس تھا کہ کسی طرح باہر نکل کے جیل کے زیادہ سے زیادہ حصے دیکھوں۔ اُس وقت سے ہی میں سوچ رہا تھا کہ اگر یہاں سے بچ نکلے تو ایک ڈائری ضرور لکھوں گا تا کہ یہاں کے شب و روز یاد رہیں۔ زیادہ تر قیدی سولیرا ادا کرنے کو ترجیح دیتے تھے۔ ہماری باری والے دن انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ سولیرے دینے ہیں یا کام پر جانا ہے۔ نصیر نے فوراً ایک سولیرہ ادا کر دیا۔ میں نے کام پہ جانے کی حامی بھر لی۔ کوئی دس قیدی آج مشقت کے لئے بلائے گئے تھے۔ پہلا کام دیکھتے ہی مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا کہ مجھے سو لیرہ دے دینا چاہئے تھا۔ سب سے پہلا کام تھا ایک ٹرک سے آٹے کی بوریاں اُتارنا۔ بوریاں شائد ایک ایک من کی تھیں لائن بنالی گئی ٹرک کے قریب جا کے ہم کاندھا آگے کرتے تھے اور ٹرک پر کھڑا آدمی زور سے بوری کندھے پر پھینکتا تھا۔ دو تین چکر میں نے لگا لئے لیکن پھر میری رفتار کم ہو گئی جس پر ایک سپاہی نے میری ٹانگوں پر پر ڈنڈا رسید کرتے ہوئے مجھے دوڑ دوڑ کے کام کرنے کے لئے کہا۔ میں نے جیب سے سولیرا نکالا اور کہا اے خدا کے بندے میری بس ہو گئی ہے مجھے جانے دو۔ اُسنے کہا کہ یہ ممکن نہیں ہے

اس لئے دوڑ دوڑ کے کام کرو۔ بہرحال گرتے پڑتے دو چکر اور لگائے لیکن اسکے بعد میری واقعی بس ہو گئی۔ اب جب میرے کندھے پر بوری پھینکی گئی تو میں زمین پر گر گیا اور باوجود کوشش کے اُٹھ نہ سکا۔ زندگی میں یہ پہلا موقع تھا جب ایسا بوجھ اُٹھایا ورنہ میری صحت تو ایسی تھی کہ چائے کا کپ بھی احتیاط سے اُٹھاتا ہوں کہ کہیں کلائی میں موچ نہ آجائے۔ اب جب میں گرا تو پولیس والے آکے مجھ پر گرجنے لگے لیکن تھوڑی دیر بعد انہیں یقین ہو گیا کہ میں بہانہ نہیں کر رہا تھا اسلئے انہوں نے مجھے پیاز اور آلو چھیلنے کا کام دے دیا۔ تقریباً سات ہزار قیدیوں کا کھانا پکانا تھا اور

آٹھ دس کھانا پکانے والوں کے ساتھ ہم دس مددگار تھے۔ بڑے بڑے دیگچے دھوتے رہے پیاز کاٹتے رہے آلو چھیلتے رہے۔صبح نو بجے سے شام کے چھ بجنے کو آئے تھے لیکن ہمارا کام ختم کو نہیں آرہا تھا آلو چھیل چھیل کے اور کاٹ کاٹ کے میرے ہاتھ تھک گئے ۔ وقت دکھانے والی یہ گھڑی بھی بڑی عجیب چیز ہے جب بہار اور خوشی کے دن ہوتے ہیں تو ایسے تیزی سے چلتی ہے کہ لگتا ہے جیسے اسے پر لگ گئے ہوں اور سختی کے اور خزاں کے دن ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ رک رک کے چل رہی ہے۔آج دن ختم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ آج تک کتنے ہی دن نو بجے سے چھ بجے تک آرام سے گزارے ہیں۔ ہم تو جیل میں ایسا کر رہے ہیں دنیا میں کتنے لوگ ہیں جنہیں ہر روز ہی ایسا یا اس سے بہت زیادہ کرنا پڑتا ہے۔ اپنے وطن کے قلی اور مزدور بہت یاد آئے جو نجانے کتنوں سالوں سے لوگوں کا بوجھ اُٹھا رہے ہوتے ہیں۔ صرف ایک دن کام کر کے مجھ پہ کھلا کہ کوئی بھی بغیر کسی بڑی مجبوری کے دوسروں کا بوجھ اپنے سروں پہ نہیں اُٹھاتا لازمی طور پہ وہ کسی نہ کسی قید میں ہوتا ہے۔آخر کسی طرح دن ختم ہو ہی گیا اور میں آ کے فرش پہ بغیر کھانا کھائے لمبی تان کے سو گیا۔ اُس کے بعد جب مشقت کی باری آئی سب سے پہلے میں سو لیرہ نکال کے دیتا تھا ۔جیل میں ہم قیدی اشاروں سے ٹوٹی پھوٹی انگلش اردو اور عربی میں ایک دوسرے کو کہانیاں بھی سناتے تھے۔ مجھے ایک ہی کہانی آتی ہے جو انہیں بھی سنائی۔ وہ کچھ ایسے ہے کہ پرانے زمانے میں کسی ملک میں رواج تھا کہ وہ اپنا ایک بادشاہ چنتے تھے۔ دس سال تک اُسکی بے حدو حساب عزت اور خدمت کرتے تھے لیکن دس سالوں بعد اُسے اُٹھا کے جنگل بیابان میں تنہا مرنے کے لئے چھوڑ آتے تھے اور پھر اپنا نیا بادشاہ چن لیتے تھے۔اس لئے جو بھی بادشاہ بنتا وہ دس سال خوب عیش وعشرت کی زندگی بسر کرتا اور جلدی جلدی خوب مال و دولت ہیرے جواہرات استعمال کرتا کیونکہ اُسے علم ہوتا تھا کہ

یہ سہولتیں عارضی ہیں اور دوبارہ میسر نہ ہوں گی۔ پھر ایک بار یوں ہوا کہ انہوں نے ایک نیا بادشاہ چنا۔ یہ بادشاہ کوئی الگ ہی قسم کا تھا۔ اس بادشاہ نے پہلے دن سے ہی اپنی زندگی انتہائی سادہ گزارنی شروع کی اور باوجود مال و دولت اور آرام و آسائش کے وہ اپنے لئے انتہائی سادہ زندگی پسند کرتا۔ دس سال جب ختم ہونے کو آئے تو یہ بادشاہ پہلے کی نسبت زیادہ خوش رہنے لگا۔ جوں جوں وقت قریب آتا جاتا تھا وہ بادشاہ پہلے دنوں کی نسبت زیادہ خوش ہوتا اور معلوم ہوتا تھا کہ وہ اُس جنگل بیابان میں جانے سے ہرگز خوفزدہ نہیں ہے بلکہ وہاں جانے کے لئے بے تاب ہے۔ لوگوں نے کہا کہ بادشاہ دیوانہ ہے ساری عمر تو سادگی سے اور ڈرتے ہوئے گزاری اور اب جب کہ جنگل بیابان میں جانے کا وقت ہے تو مطمئن اور شادمان نظر آتا ہے۔ لوگوں کا تعجب اور حیرت دور کرنے کے لئے بادشاہ نے بتایا کہ چونکہ اُسے علم تھا کہ آخر کار اُسنے اُس بیابان میں جانا ہے اسلئے اُس نے یہاں کچھ بھی نہ بنایا بلکہ اپنی ساری مال و دولت سے اُس بیابان میں اپنے لئے عظیم الشان محل باغات اور ساری سہولیتں بنوالی ہیں جہاں اُسنے یقیناً رہنا ہے۔ کہانی کا نتیجہ یہ ہے کہ عقلمند لوگ اگلے جہان کے لیے بھی اپنی بھرپور تیاری رکھتے ہیں۔ شامی قیدیوں کو یہ کہانی اچھی لگی۔

جیل میں صرف ایک چیز جو ہمارے دلوں کو حوصلہ دیتی تھی وہ یہ تھی کہ ہم ایک حد تک بے

قصور تھے یا ہم نے کوئی بہت بڑا یا غیر اخلاقی جرم نہیں کیا تھا۔ ہم نے ایجنٹ کو جرمنی کے اصلی ویزے کے پیسے دیئے تھے اُس نے ہمیں جعلی ویزے دیئے تھے۔ سقراط کی وہ بات یاد آتی تھی کہ جب اُسے سزائے موت کا حکم سنائے جانے کے بعد پینے کو زہر کا پیالہ دیا گیا تو اُس کے شاگرد نے کہا کہ مجھے اس بات کا غم ہے کہ آپ

بے قصور مارے جا رہے ہیں ۔اس پہ سقراط نے کہا تھا کہ کیا تم چاہتے ہو کہ میں قصوروار ہوتا اور مارا جاتا۔تو ہمیں یہ تسلی ضرور تھی کہ ہم نے خود کوئی جرم نہیں کیا۔

اس جیل میں ہمیں پندرہ دن گزر گئے۔ان پندرہ دنوں میں شامی قیدی ہمارے بڑے اچھے دوست بن گئے ۔لیکن ہماری بے تکلفی کی وجہ سے آہستہ آہستہ وہ کھانے کے اوقات میں ہم سے نظریں چراتے تھے۔شروع میں ہمیں کبھی کبھی قہوہ پلا دیتے تھے تاہم تھوڑے دنوں بعد جب انہوں نے دیکھا کہ ہم میں تکلف نامی کوئی چیز نہیں ہے تو وہ چھپ چھپ کے پینے لگے۔کھانا دن میں دو بار ملتا تھا لیکن پورا پورا ہوتا تھا ایسا کہ پیٹ نہیں بھرتا تھا اور ہر وقت بھوک کا احساس رہتا تھا یا شائد میرے لئے وہ کھانا کھانا مشکل ہوتا تھا۔کئی دفعہ تو ایسے ہوتا تھا کہ کسی کے گھر سے کھانا آتا تو وہ ہم سے بچنے کے لئے چادریں تان کے کھانا کھاتے تھے۔لیکن ہم بھی چادر کے نیچے سے رینگ کے اندر پہنچ جاتے اور السلام علیکم یا حبیبی کہہ کے اور، پاکستان سریا (شام) برادر برادر کہہ کہہ کے انکے ساتھ شریک ہو جاتے ۔بعض وضع دار تو خاموش رہتے لیکن بعض غیر ادبی قسم کے لوگ ہمیں باہر نکال دیتے تھے۔ہم بھی مسکراتے ہوئے ایسے ظاہر کرتے کہ یہ تو معمولی بے عزتی ہے۔اس جیل میں قیام کے دوران مجھ پر ایسے ایسے انکشافات ہوئے جو میرے لئے بہت اذیت کا باعث تھے۔صحافت ہمیشہ سے میرا پسندیدہ شعبہ رہا ہے سو وہاں بھی میں نے بے شمار قیدیوں کے انٹرویو کئے ۔ وہ کیسے یہاں تک پہنچے کیوں پہنچے۔یہاں ہر موڑ پہ حافظ الاسد کی تصویر کیوں ہے ۔جیل کے فلاں بلاک میں جانا کیوں ممنوع ہے۔ہر قیدی کی اپنی دنیا اپنے حالات اور اپنی کہانی تھی۔ایک قیدی نے کہا کہ ایک دفعہ وہ ایک ایسے کمرے میں ایک ایسی حوالات میں بند تھا جہاں اور قیدی نہیں ڈالے جا سکتے تھے۔اس لئے وہاں سے تیس قیدیوں کو نکال کے لبنان کے باڈر پر چھوڑا گیا کہ لبنان بھاگ جاؤ اور پھر اُن کو گولی مار دی گئی۔

میں اُنکی باتیں سن کر خوفزدہ بھی تھا اور حیران بھی تھا کہ اسلامی ممالک مثلاً عراق شام مصر اردن لیبیا وغیرہ میں ایسے حالات کیوں ہیں کہ بادشاہوں کو اپنی بادشاہت برقرار رکھنے کے لئے ہزاروں لوگوں کو زیر زمین رکھنا پڑتا ہے۔ٹھیک ہے اور بھی بہت سے ممالک میں یہ سب کچھ ہوتا ہے لیکن اسلامی ممالک میں تو ایسا نہیں ہونا چاہیئے۔ ٹھیک ہے ہمارے ملک پاکستان کی پولیس بھی اپنے کارناموں کے لئے مشہور ہے کہ لیکن ایک ہی وقت میں صرف جیلمیں سیاسی قیدیوں کے لئے جگہ بنانے کے لئے تیس قیدیوں کو گولی مار دینا یہ کچھ زیادہ ہی تھا۔ ہوسکتا ہے اُس نے مبالغہ آرائی کی ہو لیکن ایک سے زیادہ قیدیوں نے اس قسم کے واقعات ذکر کیا۔

اگلے دنوں میں ہماری اوپر نیچے تین چار پیشیاں ہوئیں۔ ہر پیشی کے بعد ہمیں کسی الگ عمارت میں ٹہرایا جاتا اور ہم یہ دیکھ کے حیران رہ گئے کہ شہر دمشق کے عین بیچوں بیچ ہر سرکاری عمارت کے نیچے نجی عقوبت خانے تھے جس میں سیاسی قیدیوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح بند کیا گیا تھا۔ ایک دن ایک ایسی ہی عمارت میں ہمیں تھوڑی دیر کے لئے رکھا گیا۔اصل پولیس والے ہمیں ایک دیوار کے ساتھ لگ کے کھڑا ہونے کا حکم دے کر چلے گئے اور تقریباً دو گھنٹے واپس نہیں آئے ۔ ایک کاہل اور سست قسم کا سپاہی صرف دروازے پر ہماری نگرانی کے لئے کرسی پہ بیٹھا تھا بلکہ زیادہ تر سویا ہوا تھا۔ہم میں سے جو بھی تھک کے بیٹھتا اُسے وہ کھڑا رہنے کا حکم دیتا۔ اُسکے ہاتھ میں ڈنڈا تھا اور ہمارے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ۔ پھر تھوڑی دیر بعد غالباً وہ سپاہی اپنی بوریت دور

کرنے کے لئے بلاوجہ ہمارا امتحان لینے لگا کسی کو کہتا سورت فاتحہ سناؤ کسی کو کوئی اور سورت سنانے کا کہتا۔ پھر اُسنے صالح بشارت سے پوچھا کہ امریکہ کا صدر کون ہے۔عراق کا صدر کون ہے فلسطین میں کس کی حکومت ہے۔بشارت سمجھا کہ شائد صحیح جوابات پر وہ کہے گا شاباش جاؤ تم آزاد ہو۔ بشارت نے فٹافٹ جواب دیئے۔اُس کے نوے فیصد جوابات درست تھے اس پہ اُس نے بشارت کو تھپڑ مارتے ہوئے کہا انتَ سیاسی انتَ سیاسی۔یعنی تم کوئی سیاسی قسم کے آدمی لگتے ہو۔پھر میری باری آئی کہنے لگے اسرائیل کا وزیراعظم کون ہے۔ میں نے کہا مجھے علم نہیں۔ اُسنے مجھے بالوں سے پکڑا ہوا تھا مجھے ہلا جلا کے اُس نے اصرار کیا کہ میں ضرور اُسکے سوال کا جواب دوں۔میں صالح کا حشر دیکھ چکا تھا اسلئے میں نے ذہن پہ زور دے کے کہا کہ میرے خیال میں اسرائیل کے وزیراعظم کا نام عبدالستار ایدھی ہے۔اُس ظالم نے مجھے کان پہ تھپڑ مار کے کہا تم بہت نالائق ہو اور پھر خدا کا شکر ہے کہ مجھے چھوڑ کر وہ اگلے قیدی سے سوالات پوچھنے لگا۔یہ واقعہ جب لکھ رہا ہوں تو ساتھ ہی وہ پرانا سا لطیفہ بھی یاد آرہا ہے کہ جب جنت میں جانے کے لئے لائن لگی ہوئی تھی اور دروازے پہ کھڑا ہوا فرشتہ ہر ایک سے نام پوچھ کے کہتا اب یہ سورت سناؤ اور اندر جاؤ۔ پہلے کا نام یوسف تھا فرشتے نے کہا سورت یوسف سناؤ۔دوسرے کا نام عمران تھا فرشتے نے کہا سورت عمران سناؤ۔ لائن میں ایک شخص بڑا مضطرب تھا اُسکا نام رحمان تھا۔ جب اُسکی باری آئی تو فرشتے نے پوچھا کہ تمہارا نام کیا ہے اُس نے کہا کہ میرا نام تو رحمان ہے لیکن گھر والے مجھے پیار سے کوثر کوثر کہہ کے بلاتے ہیں۔

بہرحال یہ تو لطیفہ تھا لیکن اسیری کے اُن دنوں میں ہر کوئی بلاوجہ ہم پہ رعب ڈالتا تھا اور جو دل میں آتا تھا سوال کرتا تھا۔ سپاہی اور فوجی اتنے

تھے کہ عام آدمی کم نظر آتے تھے۔تین چار پیشیوں کے بعد جج نے فیصلہ سنایا کہ ہم بے قصور ہیں ہمیں پاکستان بجھوا دیا جائے یا اگر ہمارے پاس پاکستان کی واپسی ٹکٹ نہیں ہے تو ہمیں لبنان بجھوا دیا جائے۔ وہ جج جو بھی تھا اُسنے رشوت لی تھی یا نہیں لی تھی بہرحال اُسنے بڑی ہمدردی اورتوجہ سے ہماری بات سنی۔لبنان اُن دنوں شام کے زیر تسلط تھا اور شامی مجرمان کے لئے کالا پانی تصور کیا جاتا تھا کیونکہ جنگ کے بعد وہاں روٹی کھانے کو نہ ملتی تھی اور جنگ میں ہزاروں نوجوان مارے گئے تھے۔ہمیں سوچنے کے لئے دو دن کی مہلت دی گئی۔ یہ دو دن بہت سوچ و بچار اور بحث مباحثہ میں گزرے سب کا خیال تھا کہ خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ جان چھوٹ رہی ہے اس لئے پاکستان جانا چاہئے۔دو تین بضد تھے کہ ہمیں لبنان چلے جانا چاہئے تا کہ ہم وہاں سے جرمنی کی ٹکٹیں بنوا کے نکل جائیں۔ ہم نے پولیس کو لکھ کے دیا کہ ہمارے پاس پاکستان کی ٹکٹیں نہیں ہیں لیکن ہمیں کسی طرح پاکستان بجھوایا جائے۔ دو دن بعد جب پولیس ہمیں لینے آنے والی تھی پھر وہی گفتگو شروع ہوگئی کہ جہاں اتنی مشکل اُٹھالی ہے اب لبنان جا کے قسمت آزمائی کرنی چاہئے ۔آخر میں زیادہ دوستوں کی رائے تھی کہ ایک بار ہم جیل سے آزاد ہو کے لبنان چلے جائیں تو وہاں سے اپنے

عزیزوں سے جرمنی رابطہ کر کے پیسے منگوا لیں گے اور جرمنی نکلنے کی کوشش کریں گے۔شام کے کوئی پانچ بجے ہوں گے جب دروازہ کھلا ہمیں ہتھکڑیاں لگائی گئیں اور مرکزی دفتر میں لے جایا گیا۔ وہاں ہم نے بتایا کہ ہم پاکستان نہیں بلکہ لبنان جانا چاہتے ہیں۔انہوں نے ایک زرہ بھی تعجب نہ کیا اور ہمارے دستخط کروا کے ہمیں فوجی گاڑی میں لاد دیا۔لبنان کہاں ہے۔کتنی دور ہے وہاں کیسے جانا ہے کس کے پاس جانا ہے باڈر پہ

کونسی دستاویزات دکھانی ہیں۔ ہمارے گروپ کی عورتیں اس وقت کدھر ہیں ہمیں ان سارے سوالوں کے جوابات میں صرف دھکے ملے۔

گاڑی لبنان کے باڈر کی طرف روانہ ہوگئی۔کوئی دو گھنٹے کی ڈرائیوو کے بعد ہم ویران وسنسان علاقے میں داخل ہو گئے۔ہمیں دور دور ٹینک اورفوجی نظر آرہے تھے۔علاقے سے معلوم ہوتا تھا کہ ہم کسی ملک کی سرحد عبور کر کے دوسرے ملک داخل ہو گئے ہیں۔ پھر آخر ایک مقام پہ آگے گاڑی رک گئی۔رات کا وقت تھا اندھیرا تھا اور وحشت کا عالم تھا۔ہماری ہتھکڑیاں کھولی گئیں۔

ہماری جیبوں کی تلاشی لی گئی۔پیسوں کی علاوہ گھڑیاں بھی اتروالی گئیں۔الوداعی تقریب کے دوران ہمیں اعزازی طور پہ گردن پر بڑی گرمجوشی سے ایک ایک تھپڑ مارا گیا ہمارے پاسپورٹ ہمارے حوالے کئے گئے اور بندوقیں تان کے تین فوجیوں نے ہمیں لبنان کے پہاڑوں کی طرف اشارہ کیا کہ ناک کی سیدھ میں چلتے جاؤ زندگی بھر واپس نہ آنا مڑ کے دیکھا تو گولی جسم کے پار ہو جائے گی۔ہم سب نے لرزتی ٹانگوں اور دھڑکتے دلوں کے ساتھ ہاتھ اُوپر کئے اور روبوٹ کی مانند لبنان کو چل دیئے۔ایک تو ہم پہلے ہی خوفزدہ تھے اوپر سے ہمارا ''تَرا'' نکالنے والا دوست کہنے لگا کہ کچھ قدم اور چلنے کے بعد وہ ہمیں پیچھے سے گولی ماریں گے۔اُسکی باتیں سن کے میرا دل چاہا ہے کہ اپنے اس دوست کو کہوں کہ مجھے مرنے کا اتنا دکھ نہیں ہے جتنا تمہارا شریک سفر ہونے کا غم ہے لیکن ہم سرگوشیوں میں بھی بات کرنے سے گھبرا رہے تھے مبادا فوجی اسی کو بے ادبی خیال کریں۔ پھر ہمارے عقب میں گاڑی سٹارٹ ہونے کی زور کی آواز آئی جس سے ہم واقعی ''تر پک'' گئے کہ شاید گولی چلنے کی آواز ہے۔ لیکن یہ گاڑی واپس جانے کی

آواز تھی۔

پکا یقین ہونے کے بعد ہم نے مُڑ کے دیکھا اور یہ دیکھنے کے بعد کہ واقعی گاڑی جا چکی ہے اور ہم آزاد ہیں ہم نے خوشی سے اُچھلنا شروع کر دیا ۔شہری دوست بریک ڈانس جبکہ گاؤں کے دوست بھنگڑا ڈال رہے تھے اور چک میں رہنے والے صرف خوشی سے اُچھل رہے تھے۔ہم نے آگے پیچھے دائیں بائیں گھوم کے دیکھا کہ ہم واقعی آزاد ہیں۔ہمیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ ہم اپنی مرضی سے چند قدم چل سکتے ہیں۔ زندگی بڑی عجیب و غریب چیز ہے۔ زیادہ تر نعمتوں کا احساس صرف اُس وقت ہوتا ہے جب وہ ہم سے واپس لے لی جاتی ہیں۔دو چار منٹ کے بعد اُس جنگل بیابان کی ویرانی کا خیال آیا اور ہم لبنان کو چل دیئے کچھ دیر چلتے رہے اور پھر آگے جا کے ہم بیٹھ گئے۔ وہ ڈوبتے سورج کا منظر وہ بیابان علاقہ وہ عجیب و غریب پہاڑیوں کے درمیان گھاٹی اور وہ دور جنگ سے تباہ شدہ ٹینک ایک عجیب پراسرار منظر پیش کر رہے تھے۔ شائد وہ اسرائیل اور لبنان کی سرحد کا کوئی علاقہ تھا ہم نو ساتھی تھے اسلئے ٹھیک تھے مجھے یقین ہے کہ اگر کسی کو اکیلے رات کے وقت وہاں چھوڑ دیا

جائے تو شائد خوف سے اُسکا دل بند ہو جائے۔ یہ سنسان علاقہ نو مین لینڈ تھا یعنی شام اور لبنان کے درمیان ایسی جگہ تھی جہاں کسی کی حکومت نہیں تھی۔ایک سائڈ پر شام کی فوجی چھاؤنیاں تھیں تو دوسری طرف لبنان کی ۔ہمیں انہوں نے ایسی جگہ چھوڑا تھا جہاں ہمیں دوسری طرف کوئی لبنانی فوجی نظر نہیں آ رہا تھا۔بس ٹینک نظر آ رہے تھے پہاڑوں کی چوٹیوں پر۔ہمیں خطرہ ضرور تھا کہ دور سے کوئی ہمیں گولی نہ مار دے کیونکہ اخباروں میں پڑھتے آئے تھے کہ آجکل شام اور لبنان کے باڈر پر انسانی زندگی اور کتے کی زندگی ایک برابر ہے اور باڈر پر موجود کسی بھی شخص کو گولی مار دینے سے کسی کو فرق نہیں پڑتا تھا۔کافی دیر چلتے

رہے بیٹھتے رہے چلتے رہے آخر ایک جگہ ایک دو چھوٹی چھوٹی دکانیں بلکہ چائے کے ویران سے کھوکھے نظر آئے ۔ یہ کھوکھے کچی مٹی کے بنے ہوئے تھے اور ان میں بیٹھے ہوئے دکاندار زندگی سے بیزار نظر آرہے تھے۔ انکے پاس نجانے کون آتا ہوگا قریب ہی ایک دو پیلے رنگ کی ٹیکسیاں کھڑی تھیں۔ یہاں ہم نے پوچھا کہ اس وقت ہم کس ملک میں اور کس مقام پر ہیں۔ ہمیں بتایا گیا کہ ہم لبنان میں ہیں اور اسرائیل یہاں سے بہت دور نہیں ہے۔ ہم میں سے جمشید سعودی عرب رہ کر آیا ہوا تھا۔ اُسنے آگے ہو کے ٹیکسی والوں کو بتایا کہ ہم بڑی مشکل سے شام کی قید سے رہا ہو کے آئے ہیں اور اب ہمیں کسی ایسے شہر یا گاؤں جانا ہے ہے جہاں کوئی پاکستانی رہتا ہو۔ ٹیکسی والوں نے بتایا کہ یہاں قریب ہی ایک ایسا گاؤں ہے جس میں ایک پاکستانی شخص دیکھا گیا ہے۔ اُسنے بتایا کہ جتنے بھی سزا یافتہ قیدی لبنان ڈی پورٹ کئے جاتے ہیں وہ سب سے پہلے اسی گاؤں جا کر ٹھہرتے ہیں اور پھر آہستہ آہستہ شہروں کا رُخ کرتے ہیں۔ ہم بہت خوش ہوئے اور اُنہیں وہاں چلنے کے لئے کہا۔ جمشید سے اُنکی کرائے کی بات ہوئی۔ جمشید نے ہمیں بتایا کہ یہ اتنے پیسے کہہ رہا ہے جبکہ ہمارے پاس تو ایک پیسہ بھی نہیں۔ طے یہی پایا کہ ان سے متفق ہو کے کسی طرح آبادی تک پہنچا جائے۔ جمشید نے بتایا کہ میں نے اُنہیں ڈبل کرائے کی اور ٹپ کی آفر کی ہے۔ ٹیکسی والے خوش تھے کہ ایسی خوش قسمت سواریاں ملیں۔ ہم گھبرائے ہوئے تھے کہ آگے کیا ہونے والا ہے۔ کہیں یہ ہمیں لبنانی پولیس کے حوالے نہ کردیں۔ کافی مسافت کے بعد ایک گاؤں کے آثار نظر آئے۔ ٹیکسی والوں نے ہمیں ایک جگہ اُتارا اور خود بھی باہر آگئے اور کرائے کا کہا۔ ہم سب ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ جمشید جو پہلے فر فر عربی بولتا تھا اب وہ بھی خاموش تھا۔ جب ڈرائیوروں نے چیخ چیخ کے کرائے کا کہا تو جمشید نے کہا اے میرے پیارے بھائیو سچ بات تو ہے کہ ہم غریب الوطن لوگ ہیں دمشق کی

جیل سے بمشکل چھوٹے ہیں۔تم کرائے کی بات کرتے ہو۔کرایہ دور کی بات ہے ہمارے پاس تو کھانے کو کچھ نہیں۔اگر ہو سکے تو ہمیں اپنی جیب سے کھانا کھلا دو۔یہ سُن کے وہ ٹیکسی والے تو پاگل ہو گئے اور جمشید کو گریبان سے پکڑ لیا اور لگے دھینگا مشتی کرنے۔اب ہم آٹھ کے آٹھ افراد نے بڑی مشکل سے جمشید کا کالر چھڑوایا۔ٹیکسی والے کرایہ مانگ رہے تھے اور ہم اُنکی منتیں کر رہے تھے۔جب اُنہوں نے ہماری منتیں نہ مانیں تو مجبوراً ہم نے تیزی سے گاؤں کی طرف تقریباً بھاگنا شروع کر دیا۔تھوڑی دور تک ٹیکسی والے ہمیں پکڑنے کے لئے ہمارے پیچھے بھاگے۔روڑے اُٹھا کے ہمیں مارتے رہے لیکن پھر اُنہیں اپنی ٹیکسیوں کی فکر شروع ہوئی اور وہ واپس مُڑ گئے۔ہمارا خیال تھا کہ وہ ٹیکسی لے کے ہمارے پیچھے آئیں گے لیکن خدا کا شکر ہے کہ وہ کوئی نیک اور ترس کھانے والے آدمی تھے۔اللہ تعالیٰ اُنکو جزاء دے اور اپنی جناب سے اُنہیں بے بہا فراخیاں عطا کرے۔

رات کے کوئی گیارہ بجے کا وقت ہو گا۔ہمیں تھوڑی دور گلیوں میں پندرہ سے بیس سال کے نوجوان لڑکے لڑکیوں کا ایک بڑا گروہ کھیلتے ہوئے نظر آیا۔لڑکے کوئی تین چار ہوں گے اور لڑکیاں کوئی پندرہ بیس کے قریب۔دیکھنے میں یہ بالکل یورپین بچوں جیسے تھے اور جین شرٹ وغیرہ لباس تھا البتہ بال سیاہ تھے۔ان میں سے کئی بچوں نے اپنی کمر میں بندوق لٹکا رکھی تھی۔ہمیں دیکھ کے خود ہی یہ بچے ہماری طرف بڑھے جمشید نے انہیں ساری بات سمجھائی۔انہوں نے کہا کہ وہ ایک پاکستانی کے گھر کو جانتے ہیں۔یہ سنتے ہی ہمارے اندر امید اور خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔اب بچوں کا یہ سارا گروہ آگے آگے اور ہم پیچھے پیچھے۔کچھ دیر چلے تو سامنے سے ایک شخص آتا دکھائی دیا۔بچوں نے اشارہ کر کے بتایا کہ یہی وہ پاکستانی شخص ہے جس کے گھر کی طرف ہم جا رہے ہیں۔اُنکا یہ کہنا تھا کہ ہم اُسکی طرف ایسے لپکے جیسے سیلاب کے دنوں میں متاثرین امدادی ٹرک کی طرف بھاگتے ہیں۔نو عجیب وغریب

اورمخبوط الحواس افراد اورانکے پیچھے بیس پچیس بچوں کواپنی طرف یکدم بھاگتے ہوئے دیکھ کروہ پاکستانی شخص گھبرا گیا اور پیچھے کو دوڑا۔دراصل میں یہ بتانا بھول گیا کہ ہم نے پچھلے ایک مہنے سے شیونہیں کی تھی نہ ہی بال کٹوائے تھے نہ ہی کپڑے بدلے تھے۔آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ہم کتنے خوبصورت لگ رہے ہوں گے۔جمشید نے عربی زبان میں دوڑتے ہوئے اُس پاکستانی شخص کوکچھ بتایاتو وہ ڈرتے ڈرتے رک گیا۔ہم سب دوڑ کے اُسکے گلے لگ گئے۔ہم سب اُسے ایسےمل رہے تھے جیسے وہ ابھی ابھی مسلمان ہوا ہو۔کاکا تو اُسکی گود میں چڑھ کے اُسے چوم رہاتھا اور ہمارا ایک ساتھی اُسکے ہاتھ ایسے چوم رہاتھا جیسے کوئی گناہ گار اپنے گناہوں کا اقرار کرتے ہوئے اپنے پیرومرشد کی بیعت کرتا ہے ایک دوست نے اُسے قابوکرنے کے لئے اُسکی شلوارکوایسا پکڑا کہ اُسکی شلوارا ترتے اترتے بچی ۔لبنانی بچے مفت میں ایساڈرامائی منظر دیکھ کے لطف اندوز ہورہے تھے۔اُسنے بڑی مشکل سے اپنے آپ کوہم سے آزاد کروایا اور ہم نے اُسے اپنی اردو زبان میں ساری بات سمجھائی ۔جان بوجھ کے ٹیٹھ پنجابی کے لفظ استعمال کر کے اُسے یقین دلایا کہ ہم واقعی پاکستانی ہیں۔وہ کہنے لگا کہ میں دکان سے انڈے خریدنے جارہا ہوں۔ آپ یہیں ٹھہریں میں ابھی آتا ہوں۔ہم نے کہا نہیں ہم ساتھ ہی چلتے ہیں۔چنانچہ بچوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ہم اُس کے ساتھ چل پڑے۔(میں اُسکا نام بھول گیا ہوں) پھر وہ ہم سب کواپنے گھر لے گیا۔کچا گھر تھا اور سردی سے پانی دیواروں کے اندر تک آیا ہوا تھا۔ سونے کے لئے زمین پر گدے تھے۔میں سوچتا ہوں وہ آدمی تھا کہ فرشتہ تھا۔کہانیوں اورافسانوں جیسےلوگ آج بھی کہیں نہ کہیں مل ہی جاتے ہیں۔ شیطان اور فرشتے یقینا کوئی اورمخلوق بھی ہوں گے لیکن اس دنیامیں بھی وہ قدم قدم پہ ملتے ہیں ۔اُس نے اپنی بیوی کو جگایا اور پھر دونوں نے مل کے ہمارے لئے روٹیاں اور آلو انڈے بنائے ۔اُسکے بعد ہمارے لئے گرما گرم قہوہ بنایا

ہماری باتیں سنیں۔ خود اُسنے بتایا کہ کوئی پانچ سال قبل اُسکا پاکستانی ایجنٹ اُسے امریکہ بجھوانے کے لئے دمشق کی جیلوں میں چھوڑ کے بھاگ گیا تھا پھر بالکل ہماری طرح اُسے لبنان ڈی پورٹ کیا گیا تھا اور اب وہ پچھلے تین چار سالوں سے محنت مزدوری کر کے زندگی بسر کر رہا تھا اور اُسنے باقی عمر لبنان میں ہی رہنے کا سوچ لیا تھا۔ پھر سونے کی باری آئی۔ باقیوں کے بستر کا مجھے علم نہیں لیکن میرا گدا نیچے زمین گیلی ہونے کی وجہ سے گیلا تھا اور میرا سر جس دیوار سے لگ رہا تھا وہ دیوار بھی گیلی تھی لیکن آزادی کے سامنے اِن چھوٹی چھوٹی چیزوں کی کوئی حیثیت نہ تھی۔ رات سوئے ہوئے دیواریں کسی زوردار دھماکے سے لرز اُٹھیں دور غالباً کسی ٹینک نے گولا داغا تھا۔ ہم گھبرا گئے لیکن اُس پاکستانی بھائی نے ہمیں کہا سو جاؤ یہ معمول کی بات ہے۔ اگلا دن لبنان کے اس گاؤں میں گھومتے گزارا۔ پیسے جیب میں نہ تھے اور اس پاکستانی بھائی کے گھر کی حالت اور کھانے کی مقدار دیکھ کے اُس پر بوجھ بننے کو اور کھانا مانگنے کو بھی دل نہ چاہتا تھا۔ کسی نہ کسی طرح گزارا کیا۔ باڈر پر ہونے کی وجہ سے اس گاؤں کے ستر فیصد نوجوان اور مرد جنگ میں مارے جا چکے تھے، فوج میں تھے یا فوج میں جبری بھرتی کے باعث غائب ہو چکے تھے۔ سکول جاتے بچوں کے ہاتھوں میں جہاں سکول بیگ نظر آتے تھے وہیں سکول بیگ کے ساتھ کلاشنکوف بھی نظر آتی تھی۔ گاؤں میں عورتیں ہی عورتیں نظر آتی تھیں۔ میں صبح سے بھوکا تھا اور ویسے ہی گلیوں میں گھوم رہا تھا۔ چلتے چلتے ایک کچی سی کریانہ کی دکان میں فارغ دکاندار نظر آیا سوچا اس سے معلومات حاصل کرتا ہوں کہ کس طرح لبنان سے جرمنی جایا جا سکتا ہے۔

دکاندار ایک معزز قسم کا پڑھا لکھا آدمی تھا۔ انگلش بولتا تھا اُسے باتوں باتوں میں ساری بات بتائی۔ اُسکی ایک بہت ہی خوبصورت لڑکی بھی اُسکے پاس ہی کھڑی تھی۔ اُسے دیکھ کے سمجھ آیا کہ لبنان کو دودھ اور شہد کی سرزمین کیوں کہا جاتا ہے۔ باقی باتوں کے علاوہ دکاندار کہنے لگا میرا

ایک ہی بیٹا تھا جو جنگ میں مارا گیا ہے اب میری صرف چھ بیٹیاں ہیں گاؤں میں گنتی کے غیر شادی شدہ نوجوان ہیں۔تم میری اس بیٹی سے شادی کر لو۔اُسکی بیٹی کو دیکھ کے ایک دفعہ تو مجھے چپ لگ گئی وہ واقعی بہت خوبصورت تھی۔اُس لڑکی نے بھی مجھ سے دو تین باتیں کیں میرا نام پوچھا میرے نام کی خوبصورتی کی تعریف کی اور دمشق میں ہمارے قید ہوجانے پر اظہار افسوس کیا۔ میں تصور ہی تصور میں اُس لڑکی کے ساتھ لبنان کی گلیوں میں پھرتا رہا اور ہمارے بچے اسرائیلی ٹینکوں کو پتھر مارتے نظر آئے۔پتہ نہیں کیوں لیکن میں ڈگمگاتے پاؤں شکستہ دل اور بوجھل ضمیر کے ساتھ دکان سے باہر نکل آیا۔ایک دو بار مڑ کے دیکھا رُکا، واپس جانے کا سوچا لیکن پھر آگے کو چل پڑا۔میں پچیس سال کا غیر منگنی شدہ نوجوان تھا۔اُس لبنانی لڑکی کی ہمدردی کی باتیں یاد کر کے اور اُس کے باپ کی یہ مجبوری یاد کر کے کہ چھ بیٹیاں ہیں ایک ہی بیٹا تھا جو جنگ میں مارا گیا ہے،غم سے دل چھلنی اور پاؤں بوجھل ہو رہے تھے۔میں سوچ رہا تھا کہ دنیا میں کتنی قسم کے غم اور کتنی قسم کی جیلیں ہیں۔

میرا دل چاہ رہا تھا کہ واپس مڑ جاؤں لیکن میں آگے کو چلتا رہا۔کچھ ہی دور ایک ڈھابے پہ کچھ لوگ کھانا کھاتے نظر آئے۔میں بھی کچھ دیر آرام کے لئے اُس ڈھابے کے ڈولتے ہوئے ہوئے بنچ پہ ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ بیٹھ گیا۔ کافی دیر کے بعد ہوٹل کے مالک نے اشاروں میں مجھ سے پوچھا کچھ کھاؤ گے۔میں نے جیب خالی دکھاتے ہوئے اشاروں سے بتایا کہ میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔اُس مہربان اور فرشتہ صفت شخص نے ایک روٹی کے اندر کچھ فلافل قسم کی چیز رکھ کے مجھے دی جو کہ میں نے کپکپاتے ہوئے ہاتھوں سے لے لی۔بہت لذیذ تھی۔اُس نے پوچھا کہ کس ملک کے رہنے والے ہو۔پتہ نہیں کیوں لیکن غیر ارادی طور پہ میں نے اُسے کہا کہ میں انڈیا کا رہنے والا ہوں۔ دراصل جن حالات میں مجھ سے یہ سوال پوچھا گیا تھا مجھے پاکستان کہتے ہوئے اچھا نہیں لگ

رہا تھا۔ میں اپنی بھوک مٹانے کے لئے پورے ملک کو بدنام نہیں کرسکتا تھا۔ وطن عزیز سے محبت کا قرض کہیں تو چکانا تھا۔ اگلے ہی روز تبارک کا ایک بھائی مبارک ہمیں ڈھونڈتا ہوا شام سے اس گاؤں آن پہنچا اور پھر سب سے پوچھتے ہوئے وہ ہم تک پہنچ گیا۔ ہمیں آج تک نہیں معلوم وہ ہم تک پہنچ کیسے گیا۔ کوئی فون کوئی خط کوئی وائرلیس نہیں تھی۔ لیکن اُسنے ہمیں ڈھونڈ لیا ان دونوں بھائیوں کا ذریعہ روزگار غیر ملکی کرنسی کی خرید و فروخت تھی۔ اسکے علاوہ لوگوں کو باڈر پار کروانا، اور قیدیوں کو چھڑوانا تھا۔ ان دونوں بھائیوں کے پاس ہر وقت ایک بہت بھاری رقم ہوتی تھی۔ ا نکے بارہ میں مختلف کہانیاں مشہور تھیں۔ کسی نے کہا کہ دونوں بھائی پاکستان میں قتل کی متعدد وارداتوں میں مطلوب تھے۔ پھر جب ایک پاکستانی طیارہ اغواء ہوکے شام پہنچایا گیا تو یہ دونوں بھائی بھی اسی طیارے میں تھے پھر کسی سیاسی بناء پر دونوں بھائی شام میں ہی رہ گئے۔ کسی کا کہنا تھا کہ طیارہ اغواء کرنے میں بھی انہیں بھائیوں کا ہاتھ تھا۔ بعض نے شبہ ظاہر کیا کہ ملک شام میں انکا اصل کام پہلے پولیس سے مل کے پکڑوانا اور پھر رشوت لے کے چھڑوانا تھا اور یہ پولیس کے لئے ہی کام کر رہے ہیں۔ بہرحال جتنے منہ اتنی باتیں ہمارے لئے یہ سب کہانیاں تھیں۔ ہماری جس طرح اُن دونوں بھائیوں نے مدد کی ہم عمر بھر اُنکے بارے میں اچھے ہی خیالات رکھیں گے اور انہیں دعا ہی دیں گے۔

ہم شام سے لبنان اس لئے آئے تھے کہ شائد لبنان کے ائرپورٹ سے جرمنی چلیں جائیں گے ۔ یہاں آکے پتا چلا کہ لبنان کا ایرپورٹ بمباری کی وجہ سے تباہ ہوچکا ہے اور وہاں رن وے پر اب جہازوں کی جگہ بچے سائیکل چلاتے ہیں۔ کوئی سمندری راستہ نہیں ہے۔ اگر خط پاکستان بھجوائیں تو ایک سال میں پہنچتا ہے۔ کسی بھی ملک کی ایمبیسی یہاں نہیں ہے۔ یہ کالا پانی ہے یہاں اپنی زندگی کی جنگ لڑو اور اگر لبنان سے فرار ہونا ہے تو صرف ایک ہی رستہ ہے کہ غیر قانونی طور پہ اپنی جان کا رسک لے کے یا اسرائیل جایا

جائے یا ملک شام میں داخل ہوا جائے اور وہاں سے ہوائی جہاز کے ذریعے ملک سے نکلا جائے۔ شام کا نام سنتے ہی ہم نے کانوں کو ہاتھ لگا کے مبارک کو کہا کہ ہم ہرگز شام نہیں جائیں گے چاہے لبنان میں ہماری زندگی کی شام ہوجائے۔ اُسنے بڑا یقین دلایا کہ لبنان میں زندہ رہنا ممکن نہیں ہے اگر زندہ رہنا ہے تو ہمیں غیر قانونی طور پر سرحد عبور کر کے واپس شام جانا ہوگا اُس نے ہمیں بتایا کہ چونکہ ہمارے پاس لبنان کے ویزے نہیں ہیں اس لئے کسی بھی دن لبنانی پولیس یا فوجی ہمیں گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیں گے اور یہاں لبنان میں ہمیں چھڑوانے والا کوئی نہیں ہوگا۔ دراصل یہ دونوں بھائی پاکستان میں ہمارے ایجنٹ سے رابطے میں تھے اور اُس سے رقم کا مطالبہ کر رہے تھے۔ ہمارے ایجنٹ نے انہیں یقین دلایا تھا کہ ہمارے پاکستان پہنچے پر وہاں تبارک مبارک کے بندوں کو ایک ایک پائی اخراجات کی اور بمع انکی فیس ادا کردی جائے گی۔ ہم لوگ تبارک وغیرہ کے لئے اچھی آسامی تھے اسلئے مبارک نے ہمیں تسلی دلا کے شام کی سرحد عبور کرنے پر راضی کرلیا۔ طے پایا کہ کل علی الصبح مبارک اور ہم چار دوست جن میں خاکسار مبارک صدیقی، بشارت صالح، جمشید اور نصیر شامل ہوں گے ایک ٹیکسی کے ذریعے باڈر کراس کریں گے اور اگر ہم بحفاظت پہنچ گئے تو اگلے ہی روز باقی پانچوں یہی عمل دھرائیں گے۔ ساری رات ہم اُٹھ اُٹھ کے بیٹھتے رہے اور پہلو بدلتے رہے۔ شام کا نام سن کے ہی ہماری روح کانپ رہی تھی لیکن اور کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ صبح نماز فجر پڑھ کے ہم مبارک کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔ کچھ دور ایک ٹیکسی ڈرائیور ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ یہ

ڈرائیور بھی کوئی نشئی ہی لگ رہا تھا۔اسکی کار اُس سے بھی زیادہ نشے میں تھی اور چلتی کم اور کھڑکتی زیادہ تھی۔ مجھے یاد ہے کہ اُس روز مبارک کی جیب میں ہزاروں ڈالر تھے۔ پتہ نہیں وہ اتنی رقم کہاں سے لاتا تھا اور کس کے لئے کام کرتا تھا۔ مست سا آدمی تھا جب شام سے ہمارے پاس لبنان آیا تھا تو کوئی پندرہ گھنٹے مسلسل سو یا رہا تھا۔ بہرحال اُس روز اُسنے ہمیں بتایا تھا کہ یہ ٹیکسی والا ہمیں ایک اور ٹیکسی تک پہنچائے گا جو ہمیں شام میں کسی محفوظ جگہ تک پہنچائے گی۔ وقت یاد نہیں لیکن کافی دیر ہماری ٹیکسی جانب شام روانہ رہی اور پھر یکدم ٹیکسی ڈرائیور نے گاڑی کو ایسی بریکیں لگائیں کہ ہم سب زخمی ہوتے ہوتے بچے ۔ اُسنے چیختے ہوئے عربی میں ہمیں کچھ کہا ۔ مبارک کے حکم پر ہم گاڑی سے اتر کے دوڑ کے قریبی کھیتوں میں چھپ گئے اور ٹیکسی والا فوراً واپس لبنان بھاگ گیا۔ دور کھڑے فوجیوں نے اس طرح ایک گاڑی کو آتے اور اور تیزی سے مڑتے دیکھ لیا تھا۔ ہمیں لگ رہا تھا کہ ہمیں کسی نے نہیں دیکھا۔ تبارک نے بتایا کہ آج پہلی بار فوجی اتنی صبح گاڑیوں کی چیکنگ کر رہے ہیں ورنہ عام طور پہ یہ سلسلہ دیر سے شروع ہوتا ہے۔ اس وقت ہم تبارک کے بھائی مبارک کے رحم وکرم پر تھے اور اُسکے اشاروں پر اٹھ بیٹھ اور لیٹ رہے تھے۔ مبارک نے ہمیں بتایا کہ ایک میل کا فاصلہ ہمیں چھپ کے انہی کھیتوں میں سے طے کرنا ہوگا تب کہیں جا کے ہم اس فوجی کیمپ سے دور جا نکلیں گے۔ ہم دل ہی دل میں مبارک کو برا بھلا کہہ رہے تھے جس نے ہمیں اس مصیبت میں ڈالا تھا۔ اُس نے کہا کہ اگر فائرنگ ہوئی تو جسکا جو دل کرتا ہے کرے جدھر کو موقع ملتا ہے بھاگ جائے۔ یہاں ہماری زندگی کی حیثیت اور ایک پلے کی حیثیت برابر ہے۔ ہمارے دل خوف کے مارے ایسے دھڑک رہے تھے جیسے کسی پرانی ڈیزل کار کا انجن اپنے آخری دنوں میں دھڑکتا تھا ۔ ہمیں پتہ چل رہا تھا کہ ہمارا آخری وقت آ گیا ہے۔ ہم اُس وقت مبارک کے ہاتھوں میں ایسے تھے جیسے کسی نے قربانی کا بکرا

پکڑا ہوا ہو۔ ہماری اپنی کوئی مرضی نہیں تھی کیونکہ اُن پہاڑی رستوں میں مبارک ہی ہمارا رہنما تھا۔ کچھ دیر تک ہم مبارک کے اشاروں پر اُسکے پیچھے ایک گہرے خشک نالے میں جھک کے چلتے رہے۔ پھر ہمیں فوجی بوٹوں کی آوازیں آنی شروع ہوگئیں۔ وہ ہماری ہی طرف بڑھ رہے تھے اور ساتھ اونچی اونچی آواز میں للکار رہے تھے۔ مبارک نے کہا شائد ہمارا آخری وقت آگیا ہے۔ اب فوجیوں کی آوازیں بہت قریب پہنچ گئی تھیں۔ مبارک نے ہمت کرتے ہوئے چھپے چھپے ہی عربی زبان میں کچھ چلانا شروع کر دیا اور کسی فوجی کا آرڈر سننے کے بعد ہمیں حکم دیا کہ ہاتھ اپنے سروں کے پیچھے باندھ کے کھڑے ہوجاؤ۔ اگلے ہی لمحوں میں چھ سات فوجی بندوقیں تانیں دوڑتے اور گرجتے ہوئے ہمارے روبرو پہنچ گئے۔ وہ فوجی سرخ و سفید اور انتہائی سفاک قسم کے تھے۔ صبح کا وقت اور شدید سردی ہونے کے باعث اُنکے منہ سے بھاپ نکلا رہی تھی پانچ چھ فوجی ہم پہ بندوقیں تانیں کھڑے رہے جبکہ ایک نے آکے ہماری جامہ تلاشی لی۔ تلاشی کے دوران مبارک اُنکے پاؤں میں پڑا گڑگڑاتا رہا اور عربی زبان میں کچھ کہتا رہا۔ اُس نے یہ دانائی ضرور کی کہ انکے گرجنے کے باوجود ساری کہانی اُنکو سنادی کہ ہمارے ساتھ ظلم ہوا ہے۔

انہوں نے مبارک کو بندوق کے بٹوں سے اچھا خاصا زدوکوب کیا اور پھر ہم پانچوں کو گن پوائنٹ پہ اپنے کیمپ کی طرف لے گئے۔ مبارک مسلسل ہاتھ باندھے اُنکی منت سماجت کر رہا تھا اور ساتھ ساتھ ہماری حالت زار بیان کر رہا تھا وہ چاہ رہا تھا کہ اس سے پہلے کہ وہ گولی چلائیں انہیں ہماری اور اپنی صورتحال بتا دیں کہ ہم کوئی دہشت گرد نہیں ہیں بلکہ صرف مجبوری میں بارڈر کراس کرنا چاہ رہے ہیں۔ کیمپ کے قریب پہنچنے پر ہمیں گن

پوائنٹ پہ ایک لائن میں کھڑا کر دیا گیا اور مجھے لگا کہ اب ہمارا آخری وقت آ گیا ہے۔ ایک فوجی نے بندوق کا بٹ میری کمر پر ایسا مارا کہ اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا پھر اُسنے بندوق کی نالی عین میرے سینے پہ رکھ دی اور عربی میں کچھ چلانے لگا۔ سب عزیزوں پیاروں کے چہرے ایک دفعہ آنکھوں کے آگے گھوم گئے ۔ایک فوجی تو ایسے اُچھل اُچھل کے ہمیں مار پیٹ رہا تھا جیسے اسی کام کی وجہ سے وہ بخشا جائے گا۔ ایک فوجی بار بار آ کے ہمارے بال کھینچتا تھا شائد فوج میں آنے سے پہلے نائی تھا۔ ہمارا دوست بشارت صالح جو کہ امیر آدمی تھا ابھی تک اپنے ڈالروں کی ایک بڑی تعداد پولیس سے چھپانے میں کامیاب رہا تھا کیونکہ اسنے اپنی جیکٹ کہیں سے پھاڑ کے ڈالر اندر پھینک دیئے تھے۔لیکن یہاں وہ سارے ڈالر جاتے رہے۔ ادھر مبارک کو کچھ فوجی گھسیٹتے ہوئے اپنے ساتھ کیمپ میں لے گئے۔کوئی دس پندرہ منٹ کے بعد مبارک کیمپ سے نکلا اور ہمیں کہا کہ بغیر کچھ کہے ہاتھ اٹھائے اُس کے پیچھے چل پڑو۔ ہم لرزتی ٹانگوں اور دھڑکتے دلوں کے ساتھ ہاتھ اُٹھائے شام کی سرحد کی طرف چل پڑے ہمارے عقب میں فوجی بندوقیں ہم پہ تانے کھڑے تھے اور ہمیں لگ رہا تھا کہ کسی بھی لمحے گولی ہمیں اپنا نشانہ بنائے گی۔کافی آگے جا کے میں نے زرا سی گردن موڑ کے دیکھا تو فوجی واپس اپنے کیمپ میں جا چکے تھے۔ کچھ نہ پوچھئے کتنی خوشی ہوئی۔مبارک نے ہمیں بتایا کہ میں نے ان فوجیوں کو بھاری رقم بطور رشوت دی ہے جسکی بناء پہ ہماری جان بخشی ہوئی ہے۔ مبارک نے ہمیں تسلی دی کہ اب اگلے شام کے باڈر پر اتنی سختی نہیں ہے ہمارے پاس اُسکی باتیں ماننے کرنے کے علاوہ کوئی راستہ نہیں تھا۔کوئی آدھ گھنٹہ پیدل چلنے کے بعد ہمیں شامی سرحد نظر آنا شروع ہوگئی ۔کوئی خاص باڈر نہیں تھا یا شائد مبارک بارڈر کے ہر رُوٹ سے واقف تھا اور یہ نسبتاً محفوظ راستہ تھا۔ مبارک ایک ایسا شخص تھا کہ اُسکا پلان اور بیان کسی بھی وقت بدل سکتا تھا

شام کی سرحد کے قریب پہنچ کر ایک بار پھر اُسکی ہدایات بدل گئیں۔ اُسنے ہمیں بتایا کہ ہمیں کسی نہ کسی طرح چھپتے چھپاتے شام کی سرحد کے قریب پہنچنا ہے اور اس سے پہلے کہ شامی فوجی ہمیں دیکھ لیں ہمیں فوراً لبنان کی طرف چل پڑنا ہے اور اگر وہ ہمیں روکیں تو ہم نے لبنان جانے کی درخواست کرنی ہے شام جانے کا نام بھی نہیں لینا۔ ہمیں اُسکی حکمت عملی بہت غیر مناسب لگ رہی تھی کیونکہ ہم تو لبنان سے آرہے تھے اور شام پہنچنا چاہتے تھے۔ لیکن ہم اُس وقت مبارک کے ہاتھوں میں یرغمال ہو چکے تھے ۔ مبارک اور تبارک دونوں بھائی عجیب کمانڈو اور طالبان قسم کے آدمی تھے۔ مبارک تو پتہ نہیں کس چیز کے چار پانچ کش لگا کے کہتا تھا اب میں پانچ میل پہاڑوں پر چھلانگیں لگاتا ہوا چڑھ سکتا ہوں۔ دونوں بھائی پتہ نہیں کیوں ہر وقت مرنے کے لئے تیار رہتے تھے پتہ نہیں وہ نفس مطمنہ تھے یا ویسے زندگی سے بیزار تھے۔ کہتے تھے موت جس دن آنی ہے آنی ہے اور جس دن نہیں آنی، نہیں آنی۔ جس طرح ہمیں والدین نے بچپن میں سکھایا تھا کہ خدا ایک ہے اسی طرح تبارک مبارک کے والدین نے انہیں سکھایا تھا کہ جس گولی پر تمہارا نام نہیں لکھا وہ تمہیں نہیں لگے گی اور جس گولی پر تمہارا نام لکھا ہے وہ تمہیں پوری دنیا میں سے ڈھونڈ نکالے گی۔ اُس کا فلسفہ حیات جو بھی تھا لیکن اس وقت ہم مکمل طور پر اُس کے رحم وکرم پر تھے سو ہم اُسکے اشاروں پر اُسکے پیچھے چلتے رہے شام کے قریب پہنچ کے ایک فوجی چوکی نظر آئی یہاں مبارک نے ہمیں حکم دیا کہ واپس لبنان کی طرف چلنا شروع کرو اور تم لوگوں نے ایک لفظ نہیں بولنا ۔ ہمارے عقب میں شامی فوجی ہمیں دیکھ کے ہماری طرف دوڑے اور چلائے کہ رک جاؤ نہیں تو گولی چلا دی جائے گی۔ ہم نے مبارک کے اشاروں پر ہاتھ کھڑے کر دیئے۔ فوجی ہمیں پکڑ کے گھسیٹتے ہوئے اپنے کیمپ میں لے گئے۔ یہاں مبارک نے ہم سب کے پاسپورٹ دکھائے جن پر شام کے ویزے لگے ہوئے تھے۔ مبارک نے انہیں بتایا کہ ہم

سارے بغیر ویزے کے لبنان جانے کی کوشش کر رہے تھے لیکن افسوس پکڑے گئے ۔ یہ سن کے شامی فوجیوں نے ہمیں ایک کیمپ میں بند کر دیا کہا کہ ابھی ہم پولیس کو بلاتے ہیں جو ہمیں جیل میں ڈالے گی۔ یہ سُن کے ہم لرز گئے۔ مبارک نے یہاں ہم پہ بڑا احسان کیا اور ہمارے سامنے ایک بہت بڑی رقم بطور رشوت انہیں دے کر اور منت سماجت کر کے اس بات پر راضی کیا کہ وہ پولیس کو نہ بلوائیں بلکہ ہمیں چھوڑ دیں۔ پیسے لینے کے بعد فوجیوں نے ہمیں شام کی سرحد میں دھکیل دیا۔ یہی مبارک کی حکمت عملی تھی جس میں وہ کامیاب رہا تھا۔ شام کی سرحد پر ایک ٹیکسی ڈرائیور کھڑا تھا ہمیں دیکھتے ہی کہنے لگا مجھے علم ہے کہ تم لوگ لبنان سے بھاگ کے آئے ہو۔ مبارک ایسے لوگوں کو خاموش کروانا جانتا تھا ۔ ایک بار پھر ہم دمشق کے ایک اور سستے سے ہوٹل میں پہنچ کے بے سدھ ہو کے فرش پر سو گئے

پھر اگلے مرحلے میں چار اور دوست بھی لبنان سے شام ہمارے ہوٹل پہنچ گئے۔ دمشق سے آگے پاکستان کو نکلنا کتنا دشوار تھا یہ ایک الگ داستان ہے کیونکہ ہمارے پاسپورٹوں پر لبنان ڈی پورٹ کی سٹیمپ لگی ہوئی تھی اور ہم شام میں تھے۔ اُن دنوں غالباً جنگ کے بعد یہ صورت حال یا قانون تھا کہ کسی بھی غیر ملکی کو شام سے نکلنے کے لئے وزارت داخلہ یا خارجہ سے اپنے پاسپورٹ پر خروج یعنی ملک چھوڑنے کی مہر لگوانی ہوتی تھی۔ ہمارے پاسپورٹوں کے مطابق ہمیں لبنان میں ہونا چاہئے تھا۔ قصہ مختصر ایک روز ہمارا طیارہ دمشق ائر پورٹ سے کراچی کے لئے پرواز کر گیا۔ وطن عزیز کی زمین پر قدم رکھتے ہی ہمیں لگا کہ ہم گویا ایک قسم کے دوزخ سے نکل آئے ہیں۔ آج جب میرے دوست نے میری ڈائری کو کتاب کی شکل میں شائع کرنے کا ارادہ کیا ہے اس بات کو دو سال ہو گئے ہیں ۔ سنا ہے سب واپس پاکستان پہنچ گئے سوائے ایک دوست کے جو کوشش کے باوجود لبنان سے نہیں نکل سکا۔ ہو سکتا ہے اسے وہاں کوئی دکاندار مل گیا ہو۔

پاکستان آ کے تبارک کی ایک بات یاد آئی کہ جس گولی پہ جسکا نام لکھا ہوتا ہے وہ اُسے ڈھونڈھ لیتی ہے۔ مجھے ایک دوست کی زبانی معلوم ہوا ہے کہ ہمارا ایک قید کے دنوں کا ساتھی جو ہماری طرح لبنان اور شام کے باڈر سے تو بچ نکلا تھا یہاں پاکستان آنے کے بعد کسی دشمنی کی بناء پہ پولیس نے اُسے گرفتار کیا اور فیصل آباد کے کسی گاؤں میں اُسے نہر کنارے لے جا کر جعلی پولیس مقابلے میں مار دیا۔ یہ وہی دوست ہے جسے ہر وقت لبنان شام کے بارڈر پر یہ دھڑکا رہتا تھا کہ ابھی کوئی ہمیں گولی مار دے گا۔ خدا جانے اُس کی چھٹی حس نے کیسے اُسے پہلے سے ہی خبردار کر دیا تھا کہ کوئی گولی اُسکے تعاقب میں ہے۔ ان کچھ دنوں میں جتنا ہم اُسے جان سکے ہماری رائے میں وہ انتہائی شریف النفس آدمی تھا اللہ تعالی اُسے غریق رحمت کرے۔

ڈائری ختم ہوگئی ہے آخری بات کرتا چلوں جس کے لئے یہ سب کچھ لکھا ہے ۔دو دوست کسی تاریک راہ سے گزر رہے تھے کہ اندھیرے کے باعث ایک کنوئیں میں یا گڑھے میں گر گئے۔ واپسی پر ایک تو اپنی عزت اور وضع داری قائم رکھنے کے لئے خاموش رہا جبکہ دوسرا سب کو خبردار کرتا پھرتا تھا کہ فلاں راستے سے ہرگز نہ گزرنا وہاں ایک کنواں ہے جس میں، میں گر گیا تھا۔ میری عادت بھی دوسرے شخص کی مانند ہے۔ میں نے سب واقعات لکھ دیئے ہیں کیونکہ آجکل ایک بار پھر بیرون ممالک جانے کا رجحان اور ضرورت بڑھ گئی ہے اسلئے ازراہ کرم بیرون ملک جانے سے پہلے کوشش کریں کہ آپ خود محنت کر کے اصل ویزہ اور اصل سفری دستاویزات حاصل کریں۔ جہاں جا رہے ہیں وہاں کی زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کریں کوشش کریں کہ آپکی فلائٹ براہ راست آپکی منزل مقصود کو ہی جا رہی ہو۔ اگر راہنمائی کے لئے یا بامر مجبوری کسی ایجنٹ کی ضرورت پیش آئے تو صرف اُسے ہی پیسے دیں جس کا کوئی مستقل ٹھکانہ ہو اور اچھی شہرت ہو۔ اپنی بہو بیٹیوں بہنوں خواتین کو ناقابل اعتبار ایجنٹوں کی باتوں میں آ کے اُنکے ہمراہ روانہ نہ کریں۔ ہر بات کتاب میں نہیں لکھی جاسکتی۔

○○○

جیل میں میرے ایک ساتھی قیدی کے تاثرات

1988 کا یہ واقعہ ہے جب ہم دمشق میں قید ہوئے اور بہت ہی اذیت ناک قید کاٹ کے لبنا ن بجھوا دیئے گئے۔آج بھی اُن دنوں کا سوچتا ہوں تو جسم پہ ایک لرزہ طاری ہوجاتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ کوئی خوفناک خواب تھا جو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ کے آئے ہیں۔جیل میں ایک ایک دن ایک ایک مہینے کے برابر تھا کیونکہ صبح شام دن رات ایک جیسے تھے۔ ہم بہت خوش قسمت ہیں کہ اُس جیل سے چھوٹ گئے اور جنگ کے زمانے میں شام اور لبنان کی سرحد پر فوجیوں کی گولیوں سے محفوظ رہے۔

مبارک صدیقی صاحب کا انداز تحریر چونکہ بڑا شگفتہ ہے اس لئے انہوں نے سارے واقعات بڑے ہلکے پھلکے انداز میں درج کر دیئے ہیں جب کہ حقیقت یہ ہے کہ وہ بڑا ہی مشکل وقت تھا اور ایسے اذیت ناک اور جان لیوا مرحلے تھے کہ اللہ سب کو محفوظ رکھے اور دمشق کے تہہ خانوں اور عقوبت خانوں سے سب کو بچائے ۔ ہمارے ساتھی عربی قیدی ہمیں کہتے تھے کہ تم دس سال سے پہلے جیل سے نکل ہی نہیں سکتے۔لبنان اور شام کی سرحد پر ایک دفعہ تو ایسا وقت آیا مجھے یقین ہو گیا کہ یہ ہمارا

آخری وقت ہے۔ مبارک صاحب نے کتاب میں کچھ واقعات نہیں بھی لکھے شاید کسی مصلحت کے تحت۔ کتاب میں انہوں نے لکھا ہے کہ میں صحت کا بہت کمزور ہوں لیکن میرے خیال میں دمشق کے اُن خوفناک تہہ خانوں میں سب سے زیادہ مبارک صاحب نے ہی ہمارا حوصلہ بلند رکھا اور ہر قدم پہ ہمیں کہتے رہے کہ شاید خدا کی اس میں کوئی بہتری ہوگی۔ ہمارے اپنے گروپ کے لوگوں میں ایک دفعہ غلط فہمی کی بناء پر بہت سخت قسم کی لڑائی ہوئی لیکن صلح کروانے میں مبارک صاحب نے بڑا کردار ادا کیا۔جیل میں مصیبتیں اُٹھا اُٹھا کے اور نا انصافیاں دیکھ دیکھ کے بہت سے ایسے مقامات آئے جب ہم غصے میں جذباتی فیصلے کرنے والے تھے۔مثلاً لبنان کی سرحد سے ٹیکسی پر جاتے ہوئے ہمارے تین ساتھیوں نے جو کہ گاؤں کے رہنے والے جٹ قسم کے لوگ تھے پروگرام بنایا کہ کسی طرح ٹیکسی ڈرائیور کو باندھ کے اُس کی ٹیکسی لے کے پیسے چھین لیتے ہیں۔ اسکی وجہ یہ تھی کہ ایک تو ہمارے پاس ٹیکسی کا کرایہ نہ تھا اور کرایہ نہ دینے پر وہ ہمیں پولیس کے حوالے کر سکتے تھے۔ یہاں پہ بھی مبارک صاحب نے اور خاکسار نے انہیں سختی سے ایسا کرنے سے منع کیا۔ اللہ تعالی سبکو ہر قسم کی مشکلات سے محفوظ رکھے اور دنیا بھر کی جیلوں میں قید بے گناہ لوگوں کی رہائی کے سامان پیدا کرے اور تمام ممالک کے سربراہان کو یہ توفیق دے کہ وہ اپنی رعایا کے دلوں پر محبت کے بل بوتے پر حکمرانی کریں نہ کہ بندوق کے زور پر۔آمین۔

(محمد صالح بشارت)

○○○